جلد ۸
شمارہ ۹

کراچی: ہفتہ-۲-اپریل ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

یہ بتایا جا چکا ہے کہ خدائے واحد پر ایمان کے یہ معنی ہیں کہ خارجی کائنات میں بھی اسی کا اقتدار و اختیار مانا جائے اور انسان کی اجتماعی اور معاشی دنیا میں بھی اسی کا قانون نافذ ہو۔ اگر انسان کی اپنی دنیا میں غیر خدائی قانون نافذ ہو (خواہ وہ کسی کا بنایا ہوا قانون بھی کیوں نہ ہو) تو یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ سورہ انبیا میں ہے کہ۔ ام اتخذوا آلھۃ من الارض ھم ینشرون۔ کیا لوگ اپنی معاشی دنیا میں خدا کے علاوہ اوروں کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں جن کے بل بوتے پر یہ اپنے معاشی نظام کو پھیلانا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ۔ لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اگر خارجی کائنات میں کسی اور کا اقتدار ہو اور انسانوں کی معاشی دنیا میں اور کا قانون تو اس سے دونوں جگہ ناہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون (۲۱/۲۱-۲۲)۔ سو وہ خدا جس کے کنٹرول میں کائنات کی ربوبیت کا مرکز ہے ان تصورات سے بہت دور ہے جو لوگوں نے اس کے متعلق قائم کر رکھے ہیں۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی اب قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳. ہمارے ہر عمل کا معیار قرآن ہے۔ جو بات بھی قرآن کے خلاف ہو خواہ وہ کسی کی طرف سے ہو غلط ہے۔

۴. حضور نبی اکرم انسانی بصیرت و کردار کے بلندترین مقام پر فائز ہیں لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی روایات شامل کر دی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو جاتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کو پرکھنے کا معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عالمین یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸. ربوبیت عالمین کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہو سکے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی "نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

مملکت پاکستان میں اور اس کے بعد تمام دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت قائم ہو جائے جس سے صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو سکے اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ سنت رسول اللہ ★ گورنر جنرل کا اعلان ★ ہندو پروپیگنڈہ ★ انجمن حمایت اسلام ★ ڈاکٹر خان صاحب سے ا ★ مجلس اقبال
★ عورت کا قرآن ★ اسلام کی سرگزشت ★ تاریخی شواہد ★ بزم طلوع اسلام ★ قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن ★ مس ہلین کیلر
★ حقائق و عبر ★ باب المراسلات ★ دفتری بدنظمیاں ★ بین الاقوامی جائزہ ★ عالم اسلامی ★ اندرون ہند

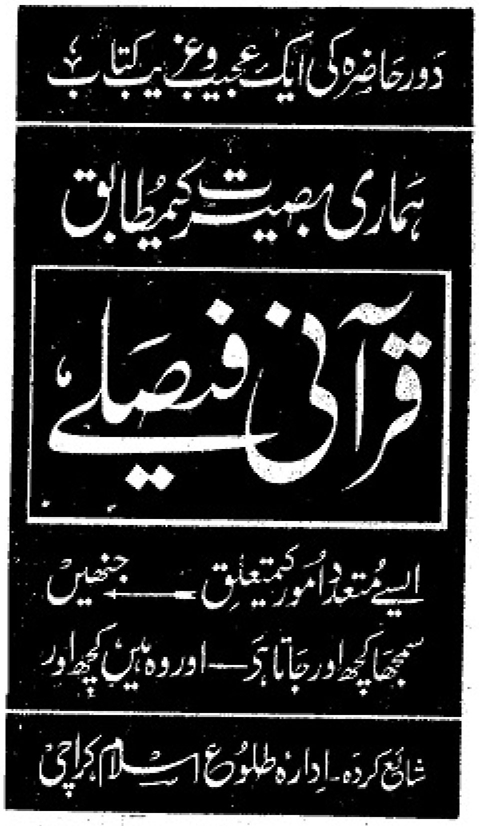

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

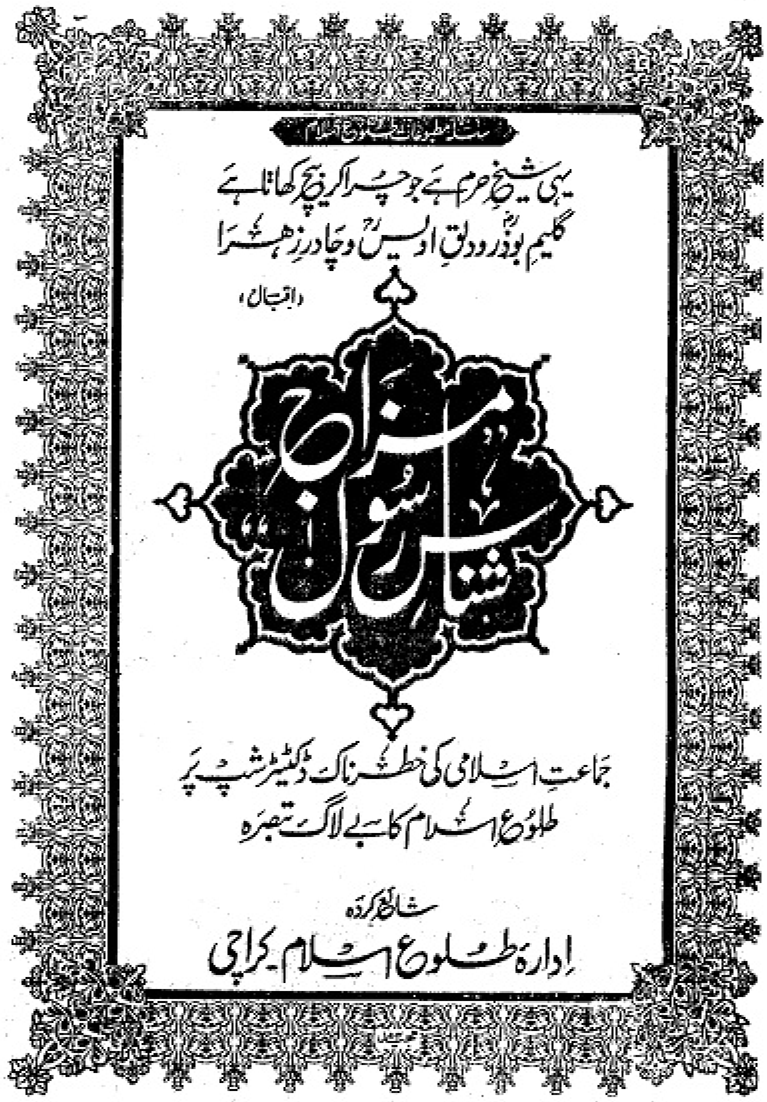

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

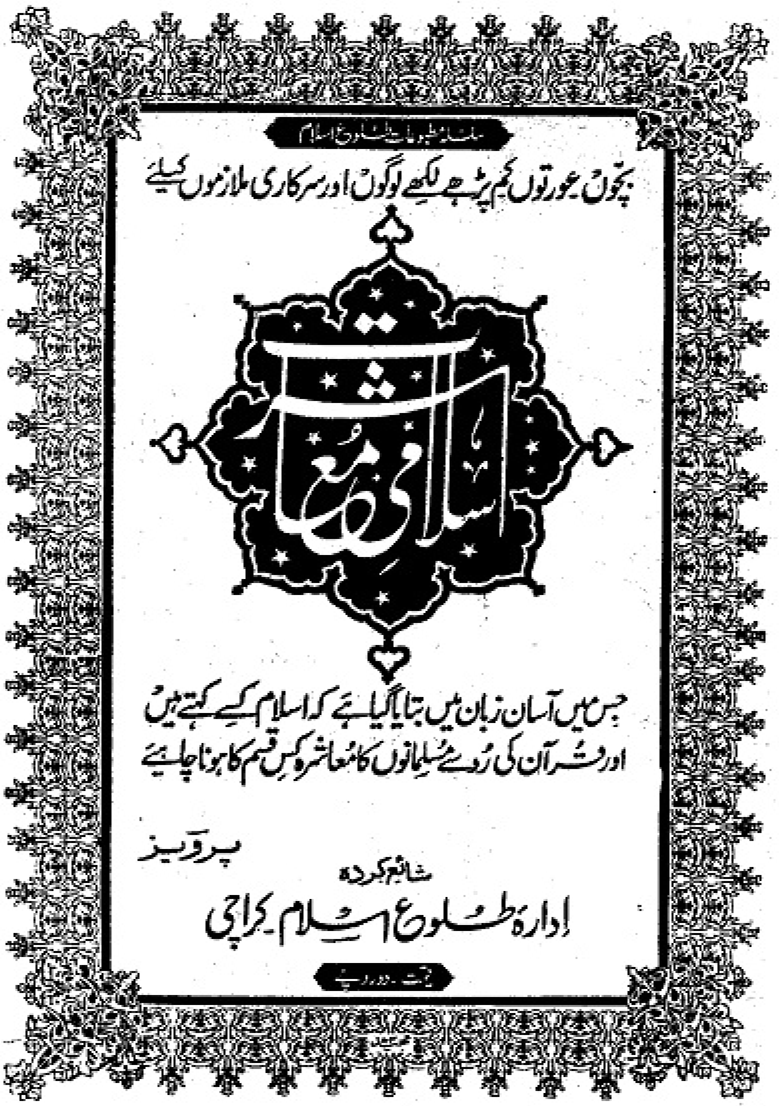

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

قیمت -/۱/۸ روپیہ

قیمت -/۲ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۲ - کراچی

ہفتہ وار
طلوعِ اسلام

جلد ۸ ۲ر اپریل ۱۹۵۵ء نمبر ۹

سنتِ رسول اللہؐ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا تو اسے جسمانی قوتیں عطا کیں اور ان کے ساتھ ہی عقل و شعور کا مادہ بھی۔ لیکن جس طرح اس کی جسمانی قوتیں محدود ہیں اسی طرح اس کی عقل و فکر کی بھی ایک حد ہے۔ اس کی جسمانی قوتوں کی محدودیت کی کمی پوری کرنے کے لئے اس کی عقل نے آلات ایجاد کئے۔ (جس چیز تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا یہ اس تک سیڑھی کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے) لیکن اس کی عقل کی محدودیت کی کمی یہ خود پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا کہ اسے اپنی طرف سے راہ نمائی دی جائے۔ اس راہ نمائی کی شرح یہ نہیں تھی کہ ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی جائے کہ زندگی کا فلاں راستہ صحیح ہے اور فلاں غلط۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کر لیتا اور اسے وحی کے ذریعے بتا دیتا کہ نوعِ انسانی کے لئے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس وحی میں نہ تو اس منتخب فرد کی اپنی عقل و بصیرت کا کوئی دخل ہوتا اور نہ ہی اس کے کسب و ہنر کا کوئی واسطہ۔ اسے وحی براہِ راست خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی۔ خدا کی طرف سے اس طرح وحی ملنے کے منصب کو منصبِ نبوت کہا جاتا ہے اور حاملِ وحی کو نبی۔

وحی کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو بتایا جائے کہ انہوں نے اس دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیے۔ اس کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کا تصفیہ کیسے ہونا چاہیے۔ مختصر الفاظ میں وحی کا مقصود یہ بتانا تھا کہ انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا جب تک اس نقشہ کی عملی شکل قائم کر کے نہ دکھا دی جائے اور انسانوں کو اس پر چلا کر یہ بتا نہ دیا جائے کہ وحی جس زندگی کا مطالبہ کرتی ہے وہ ناممکن العمل نہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر نبی کے ذمہ یہ فریضہ بھی تھا کہ وہ وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور عملاً بتائے کہ اس کے مطابق زندگی کا نقشہ کیسے مرتب ہوگا۔ نبی کے اس منصب کو منصبِ رسالت کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہم نے نبوت اور رسالت کے مناصب کا یہ فرق اس منتخب فرد کی دو حیثیتوں کو سمجھانے کے لئے بیان کیا ہے۔ ورنہ نبی رسول ہوتا ہے، اور رسول نبی ہوتا ہے۔ قرآن میں ایک ہی فرد کے لئے کہیں نبی اور کہیں رسول کا لفظ آیا ہے۔ لیکن مقصد پیشِ نظر کے اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس فرق کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یعنی خدا سے وحی ملنے کا منصب، منصبِ نبوت ہے اور اس وحی کو دوسروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق عملی نظام قائم کرنا، منصبِ رسالت۔ مقصد اس تمام پروگرام کا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلایا جائے۔ اس کو خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔

اب آگے بڑھیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب مختلف انسانوں نے مل کر ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہو تو اس نظام کا کوئی مرکز بھی ہونا چاہیئے۔ جب رسول، وحی کے نقشے کے مطابق نظام قائم کرتا تو اس نظام کا مرکز خود اس رسول کے سوا کوئی . . . . اور ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا ان تمام افراد کے لئے جو وحی کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کر کے اس نظام کے اجزاء بنتے تھے، اس رسول کی اطاعت ضروری تھی۔ یہ اطاعت درحقیقت خدا ہی کی اطاعت ہوتی تھی کیونکہ رسول اپنی ذات کی اطاعت نہیں کراتا تھا بلکہ خدا کے قوانین ہی کی، اطاعت کراتا تھا۔ لہٰذا، وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں رسول کی اطاعت کے بغیر خدا کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

خدا کی طرف سے یہ سلسلۂ نبوت و رسالت چلا آرہا تھا تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں سرزمین حجاز میں نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے۔ ان پر جو وحی نازل ہوئی وہ ایسی مکمل تھی کہ اس کے بعد نوعِ انسانی کے لئے مزید وحی کی ضرورت نہ رہی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی ذات پر نبوت کا خاتمہ کر دیا اور آپ پر نازل کردہ وحی کو قرآن کی شکل میں منضبط کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس سے نبی اکرمؐ کے منصبِ نبوت کی بھی تکمیل ہو گئی اور نفسِ نبوت کا اختتام بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم النبیین قرار دیا ہے۔

اب رہا فریضۂ رسالت، سو اس کے لئے حضورؐ نے وحی کے ذریعہ بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق ایک نظام متشکل کیا۔ اس نظام کی بنیاد اس نظام کے مرکز یعنی خود رسول اللہ کی اطاعت پر تھی۔ رسول اللہؐ اس نظام کو واضح اور نکھری ہوئی صورت میں اُمت کو دے کر اس دنیا سے تشریف لے گئے اور دنیا کو بتا گئے کہ قانون خداوندی کے مطابق انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ کس قسم کا ہوتا ہے۔

رسول اللہ کی وفات سے نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن وحی کے مطابق نظام کو تو بہر حال آگے چلنا تھا۔ اس نظام کو جماعت مومنین نے قائم رکھا اور رسول اللہ کی بجائے، خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس نظام کا مرکز منتخب کیا۔ اب افرادِ اُمت کے لئے اس مرکز کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تھی۔ (خلیفۃ الرسول کے سامنے خدا کا قانون (قرآن کی شکل میں) محفوظ تھا) اور اس کے علاوہ وہ منہاج و مسلک جس کے مطابق رسول اللہ نے اس نظام کو متشکل فرمایا اور آگے چلایا تھا۔ رسول اللہ کے اس عملی طریقہ کا نام "سنت رسول اللہؐ" تھا۔ سُنّت کے معنی ہی طریقہ ہیں۔

رسول اللہؐ نے اپنی تئیس[۲۳] سالہ رسالت کی زندگی میں اس نظام کو بتدریج متشکل فرمایا تھا۔ اس لمبے عرصہ میں حالات میں کافی تغیر و تبدل ہوا۔ جس دن حضورؐ نے اس دعوت کے لئے پہلی آواز بلند فرمائی اور جس روز آپ دُنیا سے تشریف لے گئے، اس کے درمیانی عرصہ میں یہ کاروانِ رُشد و سعادت، مختلف منازل میں سے گذرا۔ حضورؐ ایک راہ شناس اور واقفِ منزل میر کارواں " کی طرح ان تمام منازل و مراحل میں، اپنی خداداد بصیرت اور رفقائے کار، (صحابہؓ) کے مشورہ سے، حالات کے تقاضے کے مطابق عملی نقشے بناتے اور وقت اور موقعہ کے مناسب ہدایات نافذ فرماتے، مقدسین کے اس قافلہ کو آگے بڑھاتے گئے۔ مثلاً نماز جیسے اہم فریضہ میں بھی پہلے ہر نماز میں دو دو رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ بعد میں ان میں اضافہ ہوا۔ (مشکوٰۃ۔ بحوالہ مُسلم و بخاری)۔ یا مکہ میں نماز کے لئے اذان کا قاعدہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء مدینہ میں جا کر صحابہ کے مشورہ سے ہوئی۔ اب جائے ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ اس کے بعد کچھ عرصہ اور بھی اس دنیا میں تشریف رکھتے تو آنے والے حالات کے مطابق کہیں پہلے نقشوں میں رد و بدل فرماتے اور کہیں جدید نقشوں کا اضافہ فرماتے۔ لیکن حضورؐ کے بعد یہ سلسلۂ رد و بدل منقطع نہیں ہوا بلکہ آپ کے خلفائے راشدینؓ اسے اپنی خطوط پر آگے بڑھاتے گئے۔ یعنی اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق، اس مناسب رد و بدل کو نہ خلفائے راشدین نے خلاف سُنّتِ رسول اللہؐ سمجھا نہ صحابۂ کبارؓ نے اسے ایسا قرار دیا۔ (مثال کے طور پر) جب حضرت عمرؓ نے، پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ شام اور فلسطین کی مفتوحہ اراضی، فوج میں تقسیم نہیں کی جائے گی بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہے گی تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ فیصلہ خلافِ سُنّتِ رسول اللہ ہے۔ یا جب آپ نے وظائف کو علی قدرِ مراتب بڑھایا گھٹایا تو کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ جب رسول اللہ نے ان میں مساوات کو قائم رکھا تھا تو آپ ان میں رد و بدل کیسے کر سکتے ہیں[۱]۔ اس لئے کہ وہ حضرات اس حقیقت سے واقف تھے کہ حالات کے مطابق اس قسم کا رد و بدل خود سنتِ رسول اللہؐ کی اتباع ہے۔ اس لئے کہ حضورؐ خود حالات کے مطابق نظام کے نقشے میں رد و بدل فرماتے رہتے تھے۔ البتہ جن امور میں حالات

[۱] ہم نے صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کیا ہے ورنہ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن میں عہدِ نبوی کے فیصلوں میں بعد میں عند الضرورت رد و بدل کیا گیا۔ اس قسم کی ایک تبدیلی (تعلیق ثلاثہ) کے ضمن میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ عہدِ حضرت عمرؓ کی سیاست کا یہی تقاضا تھا کہ ایسا ہی کیا جاتا۔

تقاضے کسی تبدیلی کے داعی نہیں ہوتے تھے، وہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیتے تھے۔ ان میں انہی نقشوں کے مطابق چلتے رہنا، اتباعِ سنت تھا۔ یعنی، اس نظام کے مرکز کے لئے، وحی کی روشنی میں اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق نظامِ خداوندی قائم رکھنا، اتباعِ سنت تھا۔ اور افرادِ اُمت کے لئے اس مرکزِ نظام کے فیصلوں کی اطاعت کرنا، اطاعتِ خدا اور رسول کے مرادف۔ یاد رہے کہ خلفائے راشدینؓ کی عمل میں لائی ہوئی تبدیلیاں بھی سُنّت کے مفہوم میں داخل ہیں چنانچہ جمعہ کی پہلی اذان جو حضرت عثمانؓ نے شروع فرمائی تھی اور نماز تراویح کی جماعت جو حضرت عمرؓ نے شروع کی تھی سُنّت تسلیم کی جاتی ہیں۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو اطاعتِ خداوندی اور اتباعِ سنت کا یہ عملی نقشہ آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے یہ سلسلہ تھوڑے عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا۔ اب آپ اس مقام پر آ جائیے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ اس وقت ہماری صورت یہ ہے کہ

(۱) وہ اسلامی نظام موجود نہیں جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا اور صحابہؓ نے آگے بڑھایا تھا۔ ہم اس وقت بالکل انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں جو وحی کی منشاء اور سُنّتِ رسول اللہؐ کے خلاف ہے۔

(۲) ہمارے پاس قرآن ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسول اللہ کو بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔

(۳) ہمارے پاس سُنّتِ رسول اللہؐ یا آثارِ صحابہؓ کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جسے خود رسول اللہؐ یا خلفائے راشدینؓ نے مرتب کرایا ہو۔

(۴) ہمارے پاس روایات کا ایک ذخیرہ ہے جو نبی اکرمؐ اور عہدِ صحابہؓ کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے۔ (چنانچہ ان میں سب سے اہم کتاب صحیح بخاری جو تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئی تھی کا نام خود امام بخاری نے "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وایامہ" رکھا تھا) لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان مجموعوں میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ اصل بھی ہیں اور وضعی بھی۔ باہم متناقض و متخالف روایات بھی موجود ہیں جو ہو سکتا ہے کہ مختلف ادوار سے متعلق ہوں جنہیں آج ہم متعین نہیں کر سکتے۔ ایسی روایات بھی ہیں جو اپنے سیاق و سباق سے کٹی ہوئی ہیں یا جن میں ادھوری بات بیان ہو گئی ہے اور اس طرح بات کچھ سے کچھ بن گئی۔ حتیٰ کہ ایسی بھی ہیں جنہیں ہم کسی طرح بھی حضورؐ رسالت مآب کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ ایسی ہی روایتیں ہیں جن کے متعلق (اور تو اور) مولانا ابوالکلام آزاد جیسا اہلِ حدیث بھی اس کا اعتراف کرتا ہے؛ (اور ان کا یہ اعتراف صحیح بخاری کی ایک روایت پر تنقید کے سلسلے میں ہے) کہ "روایات کی قبولیت میں کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں۔ اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔" (ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ)

روایات کے ان مجموعوں کے متعلق جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رقمطراز ہیں کہ

> یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ اس پر بالکل اعتماد کر لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ صحیح سنتِ رسول اللہ اور آثارِ صحابہ کیا ہیں؟ اس لئے کہ جب تک یہ متعین نہ ہو جائے کون کہہ سکتا ہے کہ سنت رسول اللہ کی صحیح ترین شکل یہ ہے۔ اس تعین کی صورت یہ ہے کہ

(۱) سنتِ رسول اللہؐ کا ایک بڑا حصہ خود قرآن کے اندر ہے جو یقینی طور پر صحیح ہے۔

(۲) روایات کا جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے اسے پرکھنے کا معیار بھی خود قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہؐ اور صحابہؓ قرآن ہی پر عمل کیا کرتے تھے اور انہوں نے اس کے مطابق عملی نظام متشکل فرمایا تھا۔

(۳) اس ذخیرہ کو پرکھنے کا کام زید، بکر، عمر کے ذاتی طور پر کرنے کا نہیں۔ اس لئے کہ کسی فرد کو یہ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے افرادِ اُمت سے کہے کہ جس بات کو میں سُنّتِ رسول اللہ کہتا ہوں اس کی اتباع تم پر فرض ہے اگر تم اس کی اتباع نہ کرو گے تو تمہیں منکرِ رسالت قرار دے دیا جائے گا۔

(۴) اس تعین کے لئے ضروری ہے کہ اُمت قرآن کی روشنی میں پھر سے وہی نظام قائم کرے جسے رسول اللہ نے قائم فرمایا اور صحابہ نے آگے بڑھایا تھا۔ اس نظام کا یہ کام ہو کہ وہ کتبِ روایات کے اس تمام ذخیرے کو قرآن کی روشنی میں پرکھے اور پھر ہمارے لئے متعین کر دے کہ اس کی رُو سے سُنّتِ رسول اللہ کی سب سے زیادہ صحیح شکل یہ ہو سکتی ہے۔ وہ قرآن کے قوانین اور اس طرح متعین کردہ سُنّتِ رسول اللہ کی روشنی میں اُمت کو چلائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو، اس زمانے کے حالات کے مطابق، اس سُنّتِ رسول اللہ میں ضروری تبدیلی کرتا جائے جس طرح خلفائے راشدین نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں کی تھیں۔

(۵) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اس وقت تک جس طرح اُمت انفرادی طور پر سُنّتِ رسول اللہؐ کی اتباع کرتی آ رہی ہے اسی طرح کیا جائے (تاکہ اُمت انتشار سے بچی رہے) اس میں صرف اتنا دیکھ لینا ضروری ہوگا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جو صریحاً قرآن کے خلاف ہو۔ اس لئے کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہوگا وہ خود سنت رسول اللہؐ کے بھی تو خلاف ہوگا کیونکہ رسول اللہؐ قرآن ہی کی اطاعت کیا کرتے تھے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اتباعِ سُنّت کی صحیح پوزیشن جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ملک کے اربابِ فکر و نظر سے باادب درخواست کریں گے کہ وہ ان معروضات پر دل کے سکون اور فکر کی گہرائی سے غور کریں اور پھر سوچیں کہ جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اربابِ فکر و نظر سے یہ درخواست کرنا کہ وہ اس پر سکوت و سکون سے غور فرمائیں، عام حالات میں خود فکر و نظر کی توہین ہے۔ لیکن اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ کسی معاملہ پر (بالخصوص جو مذہب سے متعلق ہو) خالی الذہن ہو کر، سکوت و سکون سے غور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اور اتباعِ سنت کا سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا صحیح حل کئے بغیر ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کوئی نقشہ صحیح نہیں بیٹھے گا۔

جو حضرات یا جماعتیں، طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث پکار کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی چلی آ رہی ہیں، اُن سے بھی ہماری باادب درخواست ہے کہ وہ ازرہِ کرم صرف اتنا بتائیں کہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اُس میں کوئی غلطی ہے۔ اور اگر غلطی ہے تو کہاں۔ اس کے لئے کسی لمبے چوڑے مضمون لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فقط اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ فلاں مقام غلط ہے اور اس کی جگہ صحیح پوزیشن یہ ہے۔ اس باب میں ہم جماعتِ اسلامی کی خدمت میں خاص طور پر درخواست پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی گزارش ہے کہ وہ ایک نظر اس مضمون پر ڈال لیں جو "قرآن اور حدیث" کی "صحیح پوزیشن" کے عنوان سے اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر اس طرح ہماری کسی واقعی غلطی کی اصلاح ہو جائے تو ہم بدل شکرگزار ہوں گے اور اگر اس طرح کے غور و فکر کے بعد یہ متعین ہو جائے کہ سنتِ رسول اللہ کسے کہتے ہیں وہ کہاں سے اور کس طرح حاصل ہوگی اور اس پر عمل کیسے ہوگا۔ تو اس سے ایک بہت بڑے سوال کا حل مل جائے گا جس کے متعین نہ ہونے سے اس وقت قوم عجیب الجھن میں ہے اور جس کی وجہ سے اس کی بہت سی توانائیاں بے نتیجہ ضائع ہو رہی ہیں بلکہ مضر نتائج پیدا کر رہی ہیں۔

کیا اربابِ فکر و نظر اس طرف توجہ فرمائیں گے؟ [مختلف جرائد اور رسائل سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس مقالہ کو اپنے ہاں شائع فرما کر اس اہم مسئلہ کے حل میں ہم سے تعاون کریں جس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔]

لِلّٰہ الحمد

طلوعِ اسلام نے اپنی ستمبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> صوبوں کی لکیریں محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کا موجب بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو جس قدر جلد مٹایا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔

یہ طلوعِ اسلام کی طرف سے اٹھائی ہوئی تنہا آواز تھی اور بظاہر صدا بصحرا جس کی تائید کسی نے نہ کی لیکن اسے اس آواز کی صداقت پر اس قدر یقین تھا کہ یہ اسے برابر دہرائے چلا گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی مارچ ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں پھر لکھا کہ

> ملّت میں تفرقہ انگیزی کا ایک بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے۔ ہمارے صوبے ہمارے لیڈروں کی ہوسِ اقتدار اور حرصِ مناصب و مدارج کو بڑھانے کا موجب بن رہے ہیں .... اس بنا پر طلوعِ اسلام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ملک سے صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے مجلس دستور ساز (مرحوم) کی بنیادی کمیٹی کی رپورٹ کے سلسلہ میں لکھا کہ

> ذرا غور کیجئے کہ اس طرح مملکت کی آئینی مشینری کس طرح بھاری ہو جائیگی۔ ہر صوبہ میں الگ الگ پارلیمان۔ الگ الگ وزارتیں۔ پھر مرکز میں پانچ سو میں ارکان پر مشتمل دو ایوان۔ ان کے اوپر کابینہ۔ پھر صوبوں کے گورنر اور مرکز میں امیر مملکت تو زائیدہ مملکت کی نرم و نازک شاخیں ان بھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ جائیں گی۔ (طلوعِ اسلام - جنوری ۱۹۵۳ء)

اس پر بھی کسی نے کان نہ دھرا تو ہم نے اکتوبر ۱۹۵۳ء میں صاف صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ

> ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار یونٹ تسلیم کر کے ان میں کانفیڈریشن پیدا کر دی جائے، جس میں تمام ملازمین سے مشترکہ، مسائل اکٹھے رکھ لئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے۔

جب یہ تجویز اس قدر واضح الفاظ میں سامنے آئی تو اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ لیکن طلوعِ اسلام کو حق بات کے کہنے میں مخالفت کی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اس دعوت کو برابر دُہراتے چلا گیا۔ چنانچہ اس نے اپریل ۱۹۵۴ء میں پھر کہا کہ

> مغربی پاکستان سے الگ الگ صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے اور تمام علاقہ ایک ہی مرکز کے ماتحت رہے۔

اس تجویز کی مخالفت بھی بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کی نوا بھی تلخ سے تلخ تر ہو گئی۔ چنانچہ اس نے نومبر ۱۹۵۴ء میں لکھا کہ

> مغربی پاکستان میں صوبوں کی تقسیم پورے پاکستان کی بربادی کا باعث ہے۔ جب تک مغربی پاکستان ایک وحدت نہیں بن جاتا پاکستان میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان صوبوں کو مٹایئے اور انتظامی ضرورتوں کے لئے اس قسم کے خطے بنایئے جو موجودہ صوبائی لکیروں سے ہٹے ہوئے ہوں اور جن میں مختلف صوبوں کی مشترکہ آبادیاں ہوں۔

جو ننھی سی آواز ۱۹۴۸ء میں اٹھائی گئی تھی اور جسے دبانے کے لئے چاروں طرف سے شور و غوغا بلند کیا جاتا رہا، اس نے بالآخر اپنا اثر کیا اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء کی شام کو وزیرِ اعظم پاکستان نے اپنی نشری تقریر میں اس کا اعلان کر دیا کہ

> ہمیں مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینا چاہیئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ صوبائی تفریق کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ گذشتہ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے تشتت و انتشار کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ ویسے بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ اسمبلیاں، الگ الگ وزارتیں، الگ الگ سکرٹیریٹ، اور خدا جانے کیا کیا الگ ساز و سامان ہوں گے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ، بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی، ہمارے اربابِ حل و عقد کی سمجھ میں وہ بات تو آ گئی جسے ہم پانچ سال سے دوہراتے چلے آ رہے تھے لیکن اس کے بعد ملک میں جو طوفان برپا ہوا ہے اس سے ہمیں بھی خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اربابِ متعلقہ کہیں اس شور سے متاثر نہ ہو جائیں۔ بارے الحمد کہ جوان کہن سال، محترم غلام محمد کی ہمت نے ان تلاطم انگیزیوں کا پورا پورا مقابلہ کیا اور آج (۳۰ مارچ کی صبح) اس فیصلہ کا اعلان وجۂ اطمینان ہوا کہ مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا گیا ہے۔

حوریاں رقص کنند سجدۂ شکرانہ زنند

ہمیں اس کا احساس ہے کہ محض نظم و نسق کی خاطر پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینے سے وحدتِ ملّت کا وہ مقصدِ عظیم حاصل نہیں ہو جائے گا جس کے لئے ہم نے یہ تجویز پیش کی تھی جس طرح محض پاکستان کے خطۂ زمین سے قیامِ نظامِ قرآن کا وہ مقصدِ عظیم حاصل نہیں ہو گیا تھا جس کے خاطر حصولِ پاکستان کے لئے اس قدر جد و جہد کی گئی تھی۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح ایک خطۂ زمین کے بغیر، نظامِ قرآنی کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اسی طرح مغربی پاکستان سے صوبائی تفریق کو مٹائے بغیر، وحدتِ ملّت کا تصور بھی کبھی حقیقت بن کر سامنے نہیں آ سکتا۔ گویا جو فیصلہ اب کیا گیا ہے وہ اصل مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم ہے۔ لہٰذا وجۂ اطمینان۔ لیکن اگر ہم نے اس قدم کو آخری قدم سمجھ لیا تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے بعد، ان تفریقات کو مٹانے کے لئے بھی آہستہ آہستہ عملی طریقے اختیار کئے جائیں جن کی لکیریں ان صوبوں میں بسنے والوں کے دل اور دماغ میں گہرے نقوش بن کر جاگزیں ہو چکی ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ایک ملّت کے افراد نہیں بن پاتے۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں قرآنی خطوط کے مطابق آئین نافذ کیا جائے۔ ہم اس آواز کو آٹھ سال سے برابر دہراتے چلے آ رہے ہیں اور اس پر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس طرح ان لوگوں کو ہماری طرف سے بلند کی ہوئی اور آواز کو بالآخر سننا اور ماننا پڑا، اس آواز کو بھی ایک دن سننا اور ماننا پڑے گا۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ہندو پروپیگنڈہ

ہندو قوم پروپیگنڈے میں مہارتِ تامہ رکھتی ہے۔ تقسیم سے پہلے کی ہندو مسلم سیاست اس پر شاہد ہے کہ ہندوؤں نے عموماً ہٹلر کے اس اصول پر عمل کیا کہ جھوٹ بولو اور اسے دُہراتے جاؤ، دہراتے جاؤ تا آنکہ اسے سچ سمجھ کر تسلیم کر لیا جائے۔ تقسیم کے بعد بھی ہندو نے اس عادتِ مستمرہ کا مظاہرہ کیا۔ ان دنوں اس اصول کا نشانہ مشرقی پاکستان ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ وہاں کے ہندو بھاگ رہے ہیں کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ کوئی نہیں بتاتا۔ ہندوستانی پریس کے تبصروں کا انداز بالعموم یہ ہے۔ ہندو گذشتہ چھ ماہ سے بالعموم ہندوستان آ رہے ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جو حالات انہیں مشرقی پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہیں وہ بدستور سابق ہیں۔ یہ حالات کیا ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں لیکن ہر کوئی کف بر دہان ہے اور پاکستان کے خلاف زہر اُگل رہا ہے۔ بھارت کی لوک سبھا (ایوانِ زیریں) میں تو ہندوستانی ممبروں نے یہاں تک ہرزہ سرائی کی کہ ہندوستان کو حملہ کر کے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ یہ اس ملک کے خلاف کہا جا رہا ہے جس سے نہ محض ہندوستان کی لڑائی نہیں ہو رہی بلکہ جس سے مفاہمت کی گفتگوئیں ہو رہی ہیں اور اپیلیں یہ کی جا رہی ہیں کہ دونوں ممالک کے باشندے زبان و قلم کو احتیاط سے استعمال کریں تاکہ دوستانہ فضا خراب نہ ہو۔ یہ ہرزہ سرائی پنڈت نہرو سنتے ہیں اور وہ کسی کی زبان نہیں پکڑتے۔ وہ عموماً ایسے موقعوں پر فخریہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں تقریر و تحریر کی آزادی ہے اور اسے سلب نہیں کیا جا سکتا۔ پنڈت جی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر پاکستان بھی اسی قسم کی آزادی کا مظاہرہ کرنے پر آ جائے تو اس کا نتیجہ سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ بد لگاموں سے بازپرس کرنا تو ایک طرف خود پنڈت جی بھی اس رو میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے ترکِ وطن کو انتہائی سنگین بتاتے ہیں لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتے۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مشرقی پاکستان میں کوئی فرقہ وارانہ واقعہ ہوا ہے جس سے ہندو ہراساں ہو کے بھاگ نکلے ہوں۔ اور یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمشنر کئی بار مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد یہ اعلانات کر چکے ہیں کہ وہاں ہندو بڑے اطمینان سے رہ رہے ہیں۔

آخر ہندوؤں کے "بھاگنے" کی کیا وجہ ہے؟ ایک ہندوستانی اخبار نے اپنے وقائع نگار کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب اس نے تارکینِ وطن سے کلکتہ میں پوچھا کہ وہ کیوں ہندوستان آ رہے ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا۔ "کیونکہ اور لوگ آ رہے ہیں"۔ اس جواب میں اس ساری افراتفری کا راز ہے اور اس کے لئے ان عوامل کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جو مغربی بنگال میں مصروفِ کار ہیں بنگال اور بہار میں ایک عرصہ سے رقابت چلی آ رہی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ رقابت سنگین صورت اختیار کر گئی ہے۔ بنگال بہار کے متصل مشرقی علاقے پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا ہے اور بہار اس سے دست کش ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے دونوں صوبوں میں بعض اوقات ایسی تیز کلامی تک نوبت پہنچ گئی جو دو آزاد قوموں میں جنگ کا الٹی میٹم دینے سے پہلے ہو جاتی ہے۔ اس مقصد میں

کامیاب نہ ہو کر بنگالی ہندوؤں نے یہ تحریک شروع کردی کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو وہاں سے بلا کر مغربی علاقے میں آباد کیا جائے تاآنکہ کثرت آبادی کے بہانے سے بعد میں بہار سے کچھ علاقہ لے لیا جائے۔ یہ تحریک چنداں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے ہندوستان آکر نئے مکانات وغیرہ الاٹ کرائے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں بیچ بچا کر واپس چل دیئے۔ گویا پاکستان میں ان کی جائدادیں برقرار رہیں اور ہندوستان میں نئی مراعات حاصل کرکے انہیں بیچ کر انہوں نے اور روپیہ کما لیا۔ خود ہندوستان میں اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ابھی انہی دنوں مغربی بنگال کی وزیر مہاجرین، مسز رینو چکراورتی نے کہا کہ بہار میں جو خاندان آباد کئے گئے تھے ان میں سے ۸۰ فی صدی چھوڑ کے چلے گئے۔ اڑیسہ سے اسی طرح جانے والوں کا تناسب ۵۰ فی صدی ہے۔ اس کے بعد اچھوتوں میں پروپیگنڈا کیا گیا۔ چنانچہ مغربی بنگال کی حکومت نے اعلان کیا کہ جو ہندو ۳۱؍دسمبر ۱۹۵۵ء تک ہندوستان آئیں گے انہیں مالی معاوضہ دیا جائے گا۔ ایک طرف یہ لالچ، دوسری طرف پروپیگنڈا کرنے والے چرب زبان۔ غریب اچھوتوں کے قدم اکھڑ گئے۔

اب چالاک بنگالی ہندو اسے دو دھاری تلوار بنا رہے ہیں۔ ایک طرف وہ ان تارکین کو بہار پر مسلط کریں گے اور دوسری طرف یہی پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بھی ہو رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان نے پاکستان کو قبول نہیں کیا۔ اس کی نظریں خصوصیت سے مشرقی پاکستان پر ہیں جسے وہ کمزور کڑی سمجھتا ہے چنانچہ جب کبھی وہ دیکھتا ہے کہ پاکستان ذرا مشکل یا الجھن میں ہے تو پر تولنے شروع کر دیتا ہے۔ اب اس نے دیکھا کہ مولوی تمیز الدین کے مقدمے نے ملک میں تذبذب اور بے یقینی کی فضا پیدا کر رکھی ہے اور مشرقی پاکستان میں بھی پارلیمانی حکومت نہیں، اس لئے وہ اس نفسیاتی موقع کو استعمال کر رہا ہے۔ ضمناً اس سے ان پاکستانی ارباب سیاست کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے جو اپنے مفاد کی خاطر ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال کر دشمنان پاکستان کے حوصلے بڑھا رہے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ بھول رہا ہے کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس کی اساسی وحدت اور استحکام کا مظاہرہ ہے اور اب فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے بعد وہ مستحکم تر ہو گیا ہے۔ نیز پاکستان ایسا تر نوالہ نہیں جسے ہندوستان آسانی سے نگل جائے۔

یہ فضا پیدا کرکے ہندوستان کے وزیر مہاجرین مسٹر کھنہ ہمارے وزیر داخلہ، جنرل اسکندر مرزا، پر زور دے رہے ہیں کہ ان کے ساتھ مشرقی پاکستان کے دورے پر چلیں۔ ہمیں ایسے دورے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں کیونکہ ہماری نیت صاف ہے اور ہمیں یہ دکھانے میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے یہاں غیر مسلم کس طرح رہ رہے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری حکومت اس غوغا آرائی سے متاثر ہو کر اس حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہے کہ یہاں مشرقی پاکستان سے اب ہندو آنا شروع ہوئے ہیں۔ یہاں کھوکراپار کے راستہ سے ہر روز مسلمان مہاجرین آتے رہتے ہیں۔ اور یہ گذشتہ سات سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور تو اور یہ سلسلہ اپریل ۱۹۵۰ء کے لیاقت نہرو معاہدہ سے بھی نہیں رکا۔ تازہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سے لے کر اب تک ساڑھے پانچ لاکھ مسلمان ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان آ چکے ہیں، اس طرح اوسطاً سوا تین سو روزانہ، دس ہزار ماہانہ اور ایک لاکھ سے اوپر سالانہ غریب مسلمان پاکستان آتے ہیں، وہ پاکستان کی معیشت پر ناقابل برداشت بوجھ ہیں اور بحالی کی جملہ تدابیران سے درہم برہم ہوتی رہتی ہیں۔ کیا مہر چند کھنہ یا پنڈت نہرو اسے سنگین نہیں سمجھتے؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں ایسے حالات پیدا کریں کہ وہ مسلمان جو ترک وطن نہیں کرنا چاہتے ایسا کرنے پر مجبور نہ ہوں؟ کیا حکومت پاکستان اور جنرل اسکندر مرزا یہ نہیں سوچتے کہ جہاں وہ مشرقی پاکستان کے دورے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہیں وہاں ہندوستان کو یہ بھی جتا دیں کہ ذرا وہ بھی اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھیں اور اس سیلاب مہاجرین کی روک تھام کے لئے بھی کسی دورے کا انتظام کریں!

اے کاش ہمارے ارباب اقتدار کو کوئی بتا سکے کہ ہندو آپ کی کشادہ ظرفی کو کمزوری پر محمول کر رہا ہے اور جب کوئی دنی الطبع قوم دوسری قوم کو کمزور سمجھ لے تو پھر اس کی دراز دستیوں کی انتہا نہیں رہا کرتی۔

کیا فرماتے ہیں ڈاکٹر خان صاحب؟

ڈاکٹر خان صاحب کے بھائی غفار خاں کی سیاست مہاتما گاندھی کی سیاست کی طرح عام انسانوں کے فہم سے بالا ہے۔ یوں تو ہر کوئی اپنے اقوال و اعمال کا خود ذمہ وار ہوتا ہے اس لئے ہمیں غفار خاں صاحب سے متعلق کوئی سوال ڈاکٹر خان صاحب سے نہیں کرنا چاہیئے لیکن چونکہ پچھلے دنوں آپ نے اپنے بھائی کے بارے میں ایک بات ذمہ داری سے کہی اس لئے ہم ان سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر خان صاحب نے ۱۸؍مارچ کو کوئٹہ میں فرمایا کہ ان کے بھائی غفار خان ایک یونٹ کے حامی ہیں نیز اب جبکہ ایک یونٹ قائم ہو رہا ہے "پختونستان" کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔ بڑے بھائی تو یہ کہہ رہے ہیں لیکن چھوٹے بھائی نے ۳۰؍مارچ کو لاہور میں روزنامہ "آفاق" کے نمائندے سے ملاقات میں "مطالبہ دہرایا کہ عوام کی رائے معلوم کئے بغیر مغربی پاکستان میں ایک یونٹ بنانا مناسب نہیں...... (مزید برآں) ایک یونٹ کے سوال پر عام انتخابات کرائے جائیں"۔ ۲۵؍مارچ کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "انہیں ایک یونٹ کی تجویز سے اختلاف ہے۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے لئے ذیلی وفاق کی تجویز پیش کی جس میں پنجاب اور بہاولپور، سندھ اور خیرپور اور سرحد بلوچستان تین تہذیبی اور نسلی وحدتیں ہوں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ایک یونٹ کے حامیوں پر الزام لگایا کہ وہ چند آدمیوں کے فائدہ کے لئے ایسا کر رہے ہیں اور انہیں متنبہ کیا کہ نسلی اور لسانی تقاضوں کو نظر انداز کیا گیا تو پاکستان جمہوری ملک نہیں بن سکے گا۔

کیا یہ ایک یونٹ کی حمایت ہے؟ کیا ہمارے محترم ڈاکٹر خان صاحب اس پر غور فرمائیں گے۔

انجمن حمایت اسلام

انجمن حمایت اسلام، لاہور نے حکومت پاکستان کو ایک یادداشت بھیجی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سال رواں میں انجمن کو کوئی ۹ لاکھ ۸۱ ہزار روپے کا خسارہ ہوگا یادداشت مذکورہ میں حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ انجمن کی مالی مدد کرے۔ انجمن مذکورہ ایک قدیمی تعلیمی ادارہ ہے اور اس کی ستر سالہ خدمات ہر کہہ و مہ پر بخوبی عیاں ہیں اس کی تحویل میں متعدد تعلیمی ادارے اور یتیم خانے چل رہے ہیں۔ اب اس نے کراچی میں بھی ایک سکول اور ایک یتیم خانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تقسیم سے پہلے انجمن کا کام بخیر و خوبی چلتا تھا کیونکہ سارے برصغیر ہندو پاک سے اسے امداد ملتی رہتی تھی۔ تقسیم کے بعد آمدنی کے بیشتر ذرائع ختم ہو جانے کی وجہ سے انجمن مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئی ہے۔ چونکہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور اس میں مزید وسعت بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ انجمن کی فوری مالی امداد کی جائے۔ انجمن کا سالانہ بجٹ ۲۵ لاکھ تک پہنچ چکا ہے لیکن آمدنی پندرہ سولہ لاکھ سے زیادہ نہیں۔ ان حالات میں کسی پبلک ادارے کا کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں توقع ہے کہ حکومت حسب استطاعت ضرور اس کی مدد کو پہنچے گی۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے امراء اس کار خیر میں ہاتھ بٹائیں تو وہ انجمن کو مالی مشکلات سے نجات دلا سکتے ہیں۔ گذشتہ سات سال میں جو پاکستان نے حیرت انگیز صنعتی ترقی کی ہے اس کی بدولت متعدد افراد غیر معمولی طور پر صاحب دولت ہو گئے ہیں۔ یہ ساری دولت پاکستان کی بدولت کمائی گئی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کا کچھ حصہ رفاہی امور پر صرف نہ کیا جائے۔ اگر امرائے پاکستان اس ضرورت کو محسوس کر لیں تو ایک طرف حکومت کے محدود ذرائع پر خواہ مخواہ کا بار نہیں پڑے گا اور دوسرے خدمت کرنے والے اداروں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور ملکی تعمیر و ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔

غور کیجئے! دولت کی غیر قرآنی تقسیم کس قدر مشکلات پیدا کر دیتی ہے لیکن بحالات موجودہ اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ دولت مندوں سے خیرات کی اپیل کی جائے۔

نوجوانوں کے لئے
فکر و نظر کی
نئی راہیں
سلیم کے نام
از پرویز

تاریخی شواہد

۹

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیارِ قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیلِ آسمانی نہ تھی، لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراکِ وطن یا نسل کو وجہ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعارِ ملی بنایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیارِ تقسیم انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آ چکا ہے۔ اور اس کے اربابِ فکر و نظر، قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے، نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ مشہور فرانسیسی مؤرخ رینان (ESSAY ON NATTONALITY) میں لکھتا ہے کہ

> انسان کی روح دریاؤں کے رخ اور پہاڑوں کی سمتوں میں مقید نہیں ہو سکتی۔ وطن کی سرزمین انسان کے لئے جائے قیام اور کشمکش و کاروبار کے لئے ایک میدان مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان (اس کے لئے) روح مہیا کرتا ہے، اس مقدس تشکیل کے لئے جسے قوم (یا ملت) کہا جاتا ہے۔ آدمی ہی سب کچھ ہے۔ مادی اسباب میں سے کچھ بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

اور (LORD BRYCE) اپنی کتاب (International Relations) میں لکھتا ہے:

> جس چیز پر کسی قوم کی اندرونی اور سب سے گہری زندگی کا انحصار ہے وہ مذہب ہی ہے۔

یورپ کا ایک اور مدبر (HENRY SIDWICK) اگرچہ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ (اس لئے کہ اس کے سامنے یورپ کی مختلف اقوام موجود ہیں جو ایک مذہب (عیسائیت) کے باوجود الگ الگ قومیت کی مدعی ہیں) لیکن جس شے کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے وہ اسلام میں مذہب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں "من تو شدم تو من شدی" کا شعور پیدا ہو جائے۔ یہ شعور کہ وہ ایک "جسدِ واحد" کے مختلف اعضا ہیں۔۔۔۔ اگر ان میں یہ شعور موجود ہو تو ہم انہیں ایک قوم کے افراد قرار دیں گے خواہ ان میں کوئی اور وجہ جامعیت ہو یا نہ۔

(Elements of Politics)

اسلام میں یہ شعورِ یگانگت اس وحدتِ فکر و عمل سے پیدا ہوتا ہے جس کا نام ایمان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم مختلف شعوب و قبائل (اقوام و ملل) کا اعتراف (RECOGNISE) کرتا ہے۔ لیکن صرف تعارفی غرض کے لئے۔ اس سے زیادہ اور کسی مقصد کے لئے نہیں۔ جیسے کسی شخص کے پانچ سات بیٹے ہوں تو وہ تعارف (پہچان) کی خاطر ان کے الگ الگ نام رکھ لیتا ہے۔ یا جس طرح محض انتظامی غرض کے لئے کسی مملکت کے مختلف خطے (صوبے) بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کا کچھ تعارفی نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کے مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں میں تعارفی نشانات کو روا رکھا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ تفریق ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث یا قومی عصبیت اور غیریت کا موجب بننے لگے تو یکسر غیر اسلامی ہے اور اس کا مٹانا نہایت ضروری۔ قرآن کریم کی رو سے معیارِ فضیلت فقط تقویٰ ہے اور بس۔ تمام انسان ایک اصل کی مختلف شاخیں ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اس لئے یہ چیز کہ کوئی شخص کسی آدمی کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے۔ یا اس کا وطن کونسا ہے، نہ وجہ امتیاز بن سکتا ہے نہ باعثِ تفریق۔ قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ
إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (۴۹/۱۳)

اے نوعِ انسانی! ہم نے تمہیں (سب کو ایک ہی طرح) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن یاد رکھو کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا خبردار ہے۔

چونکہ نسل کی بنیاد پر قبائل کی تقسیم میں ایک دوسرے پر برتری اور فضیلت کا امکان زیادہ تھا (کہ اونچی اور نیچی ذاتیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی دعوت کے ذکر میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ اگر کسی کا اپنا بیٹا بھی کسی دوسری آئیڈیالوجی (ایمان) کو مانتا ہے تو وہ اور اس کا باپ دونوں ایک جماعت کے رکن، ایک برادری کے فرد، اور ایک قوم کے آدمی نہیں بن سکتے۔

إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶) سے بعض حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا یہ بیٹا ان کی بیوی کے عملِ بد کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے:

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ ۖ
كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا
عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ۝ (۶۶/۱۰)

ان لوگوں کے لئے جو (حق و صداقت کی دعوت کا) انکار کرتے ہیں۔ اللہ نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے زیر تھیں لیکن انہوں نے ان کی خیانت کی تو وہ اللہ کے (فیصلہ کے) مقابلہ میں دونوں ان کے کسی کام نہ آ سکے (وہ تباہ ہو کر رہیں۔ اور رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت ان کے کسی کام نہ آ سکی) اور (ان سے) کہا گیا کہ تم دونوں جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

لیکن حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی اس "خیانت" سے خیانتِ عصمت مراد لینا دور از قیاس بات ہے۔ چنانچہ خود اس آیت سے متصل آیت:

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ
إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن
فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ (۶۶/۱۱)

اور ایمان والوں کے لئے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے عرض کیا اے میرے رب میرے لئے اپنے پاس جنت میں گھر بنا۔ اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے نجات دے اور مجھے ظالمین کی قوم سے بچائے رکھ

ان آیات میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کا تقابل فرعون کی بیوی سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ تقابل یہاں کفر و ایمان کا تقابل ہے۔ عصمت و بے عصمتی کا نہیں۔ پھر حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے کا معاملہ کفر و ایمان سے متعلق تھا۔ اگر ان لوگوں کا خیال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر حضرت نوحؑ کا بیٹا "ان ہی کا بیٹا" ہوتا تو اسے عذابِ خداوندی سے نجات مل جاتی۔ خواہ وہ دعوتِ نوحی کا منکر ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ یہاں تو بتانا ہی یہ مقصود تھا کہ خواہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو اگر جماعتِ مخالف (منکرین) میں شامل ہے تو نسبی تعلق اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو نسبی رشتہ کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ اور حضور خاتم النبیین کے عہد ہمایوں میں بدر و حنین کے میدانوں نے دیکھ لیا کہ کس طرح نسبی تعلقات، ایمانی رشتہ پر قربان کئے جاتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت از پرویز

نوعِ انسانی کا سب سے مشکل مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے انسانی فکر اس مسئلے کے حل میں آج تک کس طرح ناکام رہا ہے اور قرآن اس کا کیا حل دیتا ہے۔

جس طرح کارل مارکس نے کمیونزم کا منشور شائع کیا تھا اسی طرح یہ کتاب

قرآنی نظامِ ربوبیت ہے

جو عنقریب چھپ کر تیار ہو جائے گی۔

دعوتِ قرآن

(۸)

خدا

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ وَلَوْ اَنَّ
مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ
سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ
(لقمٰن ۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز بڑی خوبیوں والا ہے اور جتنے درخت ساری زمین میں ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے، اس کے علاوہ اور بھی سات سمندر دوات بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی باتیں بھی ختم نہ ہوں بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

رسول

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (احزاب ۵)

محمد، تم مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۷)

اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا الا یہ کہ سارے عالم پر مہربانی کرنے کے لئے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۱)

اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمد ۲)

اور اے پیغمبر! آپ اپنی فروگزاشتوں کے لئے خدا سے سامانِ حفاظت طلب کرتے رہیئے اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لئے بھی۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (توبہ ۱۳)

اور آپ جماعتِ مومنین کے ساتھ ساتھ چلتے رہیئے کہ آپ کا ساتھ ساتھ چلنا اُن کے لئے موجبِ سکون اور اطمینان بخش ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (احزاب ۷)

اللہ کا قانون اور کائنات کی تمام قوتیں اس نبی کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی ہیں۔ اے مسلمانو! تم بھی اس نبی کے ساتھ ساتھ چلو اور پوری پوری تسلیم و رضا کا ثبوت دو۔

قرآن مجید

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (آل عمران ۱۱)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو صحیح صحیح پڑھ کر سناتے ہیں۔

(۱) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یٰس ۵)

یہ تو بس کیا بجز اس کے کہ قوانین الٰہیہ کو سامنے لے آنے والی اور پراگندہ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کر دینے والی کتاب ہے۔ تاکہ یہ ان کو بدعملی کے نتائج سے آگاہ کر دے جن میں زندگی کے آثار ہوں۔

(۲) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (بنی اسرائیل ۱)

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے، جو بالکل سیدھا ہے اور اُن ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں، یہ خوشخبری دیتا ہے کہ اُن کے لئے اجرِ عظیم (رکھا) ہے اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے اُن کے لئے نہایت دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔

(۳) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى
اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۰)

اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے ہوئے نہیں رہتے۔

(۴) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ
(واقعہ ۳)

"سو میں ستاروں کے غروب ہونے کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی بھاری شہادت (یعنی دلیل) ہے یہ بہت مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے کہ اس تک بجز پاکیزہ لوگوں کے کوئی رسائی نہیں پاتا۔ یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے۔ سو کیا تم لوگ اس کلام کو ایک سرسری بات سمجھتے ہو۔"

(۵) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ
كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ
كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الحاقہ ۲)

میں ان ہی چیزوں کو شہادت میں پیش کرتا ہوں جن کو تم دیکھتے ہو اور اُن چیزوں کو بھی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ کہ یہ قرآن کلام ہے ایک معزز رسول کا لایا ہوا۔ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے، تم لوگ بہت کم سمجھتے ہو۔ یہ رب العٰلمین کی طرف سے نازل شدہ کلام ہے۔

(۶) فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ
اِذَا تَنَفَّسَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي
الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ...... وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْ
هَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ
اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (تکویر ۱)

پھر میں ان ستاروں کو شہادت میں پیش کرتا ہوں جو پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں، چلتے رہتے ہیں، جا چھپتے ہیں۔ اور رات کو جب وہ جانے لگے اور صبح کو جب وہ آنے لگے کہ یہ قرآن کلام ہے اس رسول کا لایا ہوا جو قوت والا ہے، مالکِ عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے...... اور یہ قرآن شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔ پھر تم لوگ بہکے کہاں جا رہے ہو؟ یہ تو ایک نصیحت نامہ ہے ساری دنیا والوں کے لئے، ہر اُس شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہے۔

(۷) وَالسَّمَاۗءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ
فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (طارق ۱)

اور آسمان شاہد ہے جس سے بارش ہوتی ہے اور زمین شاہد ہے جو پھٹ جاتی ہے کہ یہ قرآن قولِ فیصل ہے اور وہ کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔

(۸) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (انعام ۷)

کوئی خشک و تر ایسا نہیں ہے۔ جو خدا کے واضح قانون میں موجود نہ ہو۔

مجلسِ اقبال

(۳)

ہم کو حیرت ہے کہ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کے "انا الحق" کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی "انا، انا" سے اس قدر بیزار !!

منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں

ناہداں منصور را خوں کردہ اند　　　بے کس و معذور را خوں کردہ اند

مردِ حق گو را بدار آویختند　　　بے گنہ را خوں بناحق ریختند

ہٰذا اے زہادِ آشفتہ دروں　　　ہٰذا اے ستیزہ کارانِ جنوں

خونِ منصور از شما خواہم گرفت　　　خفتہ خوں را خوں بہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت "مسئلہ اعیان" کی وجہ سے کی ہے اس کے جواب میں پیرزادہ صاحب نے شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب تلویح سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اس کی مدح سرائی فرمائی ہے۔ فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لئے یہ جواب ایک لطیفہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے۔ پوچھا کہ اس کے درجے کا اور کوئی حکیم نہیں؟ ارسطو نے کہا نہیں، پھر مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کے نام لئے ارسطو نے سوائے بایزیدؒ کے اور کسی کو افلاطون کا ہم مرتبہ نہ بتایا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب اسی بنیاد پر اس کی بابت کہتے ہیں۔

جبرئیلے در لباسِ آدم است

ہم کو امید تھی کہ پیرزادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کریں گے۔ لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا

اے کہ حافظ را شماتت می کنی　　　رندِ مے کش را ملامت می کنی

اے بعلمِ خویش مخمورِ عمل　　　تو چہ دانی سرِ مستانِ ازل

اصل مرکزِ بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام ایک حقیقی پیغامِ عمل ہے باوجود پیرو اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آکر غالب ہوگیا ہے اور وہ تصوف ہے۔ اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس کشی[1] نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔ کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیاتِ اسلامیہ میں ساری ہوگیا ہے اور ہر قوم کی ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے، اس لئے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوتِ عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوعِ انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفۂ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا اس وجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے دیباچہ میں خود انہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے یہ ہے۔

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔

(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔

(۳) تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے بلکہ انہوں نے خود تحقیقات کی ہے

(۱) میرے آبا و اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میرا میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔

(۲) فلسفۂ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہوگئی تھی۔

---

[1] تصوف نفس کشی سکھاتا ہے، لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، وہ صرف اصلاحِ نفس کا خواہاں ہے۔

کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیتِ مجموعی منجر بہ تصوف ہے

(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخِ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا، اس واسطے میں نے تصوف کو ترک کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ "کہ میرا نسبی و نسبتی تعلق ایک قدیم صوفیانہ خاندان سے ہے، میرے آبا و اجداد نے نسلاً بعد نسلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جدِ اعلیٰ ہیں اس وقت تک تصوف کے دامانِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ "اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے"۔

تصوف کا مسئلہ "عینیت" افلاطون کے مسئلہ "اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے "ہمہ اوست" کے عقیدہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ہر ذرہ عین آفتاب ہوگیا اور خالق اور مخلوق متحد ہوگئے۔ چند اقوال بطور امثال کے لکھتا ہوں۔

" انا الحق "

" سبحانی ما اعظم شانی "

" سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا "

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ　　　خود بر سرِ بازارِ خریدار برآمد

خود انا الحق زد لبِ منصور　　　خود برآمد ز شوق بر سرِ دار

گفتﷺ انا احمد بلا میم　　　از زبانِ محمدِ مختار

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست　　　خیالِ آب و گل در رہ بہانہ

یہاں تک کہ بعض یکے تازانِ میدانِ تفرید کلمۂ توحید کو بھی شرک خیال کرتے ہیں

اے پسر لا الٰہ الا اللہ　　　خود ز شرکِ خفی است آئینہ دار

ہست شرکِ جلی رسول اللہ　　　خویشتن را ازیں دو شرک برار

ایک اور سرمست کا ترانہ سنئے۔

من ہم زمینم ہم سما من باتوستم جابجا　　　من مصطفےٰ را ہم خدا من طحہ دیرینہ ام

فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے۔

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد　　　موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

تجرید کا یہ نعرۂ مستانہ بھی سن لیجئے جس میں قافیہ کی پابندی بھی ترک کر دی گئی ہے۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک　　　ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک

ان شطحیات کا ایک انبار ہے، ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ نا آشنائے سرِ وحدت کا قلم لرزتا ہے، اور یہ اُن حضرات کے اقوال ہیں جن کا ایک ایک لفظ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں بے بہا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

تمام مصلحوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ علم و عقیدت کی جنگ ہے۔ مصلح دیدۂ تحقیق سے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ اے قوم جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے کیونکہ زہریلا سانپ ہے۔ مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں یہ تازیانہ ہے۔

بوقتِ صبح شود ہم چو روز معلومت　　　کہ با کہ باختہ عشق در شبِ دیجور

اس جنگ کے ہزار ہا تماشے دنیا دیکھ چکی ہے لیکن ابھی تک بدستور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، قوم اس کو جاہل، دشمنِ اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالیؒ، ابنِ رشد، اور امام ابنِ تیمیہ رحمہم صحیح رستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلا وطن کیا جاتا ہے، کسی کو قید خانے میں جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علمِ یقینی پر ہو، محض رسمی عقیدہ "عیارستانِ بازارِ تحقیق" میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

---

[1] خود ڈاکٹر اقبال کو بھی یہ میم پسند نہیں آیا ایک جگہ لکھتے ہیں

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے　　　قوم دنیا میں یہی احمدِ بے میم کی ہے

معلوم نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ کے بعد جس طرح تصوف کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال بدلا ہے اسی طرح اس عقیدہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی یا ابھی تک معذور صہبائے محبت "ہیں اور "خاکِ عرب کے سونے والے کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں"۔

اسلام کی سرگذشت

جزیرۂ عرب اور قبائل عرب کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات اور سرحدوں میں عرب کی متمدن و مہذب مملکتوں کے قیام کا تذکرہ بھی کیا جا چکا ہے۔ جن میں شعر و ادب کے انحلال سے گفتگو کی جا رہی تھی۔ موجودہ اشاعت میں عربوں میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی ہے

انیہ جو کچھ صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ حضارت و تمدن شعر کی ان انواع کو واقعی فنا کر دیتا ہے جو صرف صحرا نشینی ہی میں زندہ رہ سکتی ہیں۔ جیسا کہ بہت سی ان انواع و اقسام کو وہ پیدا کر دیتا ہے۔ جو تہذیب و تمدن کے گہوارۂ عیش و نعیم ہی میں زندہ رہ سکتی ہیں۔

ہمارے خیال میں اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ اہل حیرہ اور غسانی قبائل میں شاعر تو ضرور ہوں گے۔ لیکن ان کی زبان الگ اور ممتاز ہو گی۔ قریشی زبان نہیں ہو گی۔ جو سارے حجاز پر چھائی ہوئی تھی کیونکہ حیرہ اور غسان حجاز سے بہت دور واقع تھے۔ اس لئے وہاں قریشی زبان اپنا تسلط نہیں جما سکی۔ پھر چونکہ اہل حیرہ اور غسانی اپنے آس پاس کے عربوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھے اس لئے وہ اپنے علاوہ دوسروں کی زبان کی پیروی کرنے میں عار بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ شعر کے لئے ان کے مخصوص اوزان ہوں۔ جو ان کی زبان اور ان کی عقلیت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔ جب اسلام آیا اور قرآن کریم قریش کی زبان میں نازل ہوا تو قریشی زبان کی سیادت اس طرح مسلم ہو گئی کہ مورخین کے ان چیزوں کے بیان کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی جو قریشی زبان اور اس کے قواعد اور اوزان سے اختلاف رکھتی تھی۔

عدی بن زید کے ان اشعار کو جو نقل کئے گئے ہیں تیز شعراء جزیرہ کے حیرہ اور غسان کی طرف جانے کو ہماری اس رائے کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عدی ابن زید کی۔ (جیسا کہ راویوں نے بیان کیا ہے) جزیرہ کے عربوں سے رشتہ داری تھی۔ رہا جزیرہ کے شعراء کا حیرہ اور غسانی دربار میں جانا تو یہ کوئی بڑا اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ اہل حیرہ اور غسانیوں کی زبانیں بالوجہ دیگر حجازی زبانوں سے مختلف تھیں۔ تاہم اس سے قریب ضرور تھیں کیونکہ وہ بنیاد جس سے عرب کی تمام زبانیں اور لہجے نکلے ہیں ایک ہی تھی لہذا یہ بعید نہیں ہے کہ اہل حیرہ اور غسانیوں کی اپنی الگ زبان بھی ہو اور اس کے باوجود قریش کی زبان کو بھی جب وہ ان کے سامنے بولی جائے سمجھ سکتے ہوں۔

اس رائے کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اہل نسب (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) اس طرف گئے ہیں کہ لخمی اور غسانی قبائل یمنی الاصل ہیں۔ معتمد مورخین قدیم زمانہ سے آج تک یہ تاکید کرتے چلے آئے ہیں کہ اہل یمن کی زبان قریش کی زبان سے مختلف تھی چنانچہ

اس بارے میں ابن خلدون کا بیان ہے کہ "مضری زبان حمیری زبان کے بالمقابل تھی۔ مضری قبائل کے ہاں بہت سے حمیری زبان کے موضوعات اور کلمات کی گردانیں بدلی ہوئی تھیں۔ جس کی شہادت ہمارے پاس موجود ہیں جو آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں کچھ لوگ اپنی کوتاہی نظر سے اس طرف گئے ہیں کہ حمیری اور مضری زبانیں ایک ہی تھیں اور وہ حمیری زبان کے قوانین کو مضری زبان کے قوانین و قواعد پر قیاس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ "قیل" حمیری زبان میں "قول" سے مشتق ہے وغیرہ ذالک۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ حمیری زبان اپنی بہت سی اوضاع اور گردانوں میں اور اعراب و حرکات میں مضری زبان سے قطعی مختلف ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۱)

لخم اور غسان کی اصل کے بارے میں جو کچھ نسب نگاروں نے بیان کیا ہے اگر ہم اسے تسلیم نہ کریں تو دونوں زبانوں کا اختلاف اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لخمی اور غسانی دراصل نبطی تھے۔ نہ یمنی تھے اور نہ ہی خالص عرب تھے۔ ان کا شعر و ادب نبطی زبان میں موجود تھا۔

۳۔ یہودیت و نصرانیت

جزیرۂ عرب میں اجنبی ثقافتوں کے پھیلنے کے اسباب میں سے یہودیت و نصرانیت کا پھیلنا بھی تھا۔

یہودیت: یہودیت اسلام سے صدیوں پہلے جزیرۂ عرب میں پھیل چکی تھی۔ وہاں یہودی مستعمرات قائم ہو چکے تھے جن میں سے مشہور ترین مستعمرہ یثرب تھا۔ جس کا نام بعد میں مدینہ رکھ دیا گیا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جزیرۂ عرب کے یہ یہودی کون تھے؟ کیا یہ یہودی النسل تھے یا عرب ہی تھے۔ جو یہودی بن گئے تھے۔ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ کہاں سے آئے تھے؟ کیا فلسطین سے یا کہیں اور سے؟ روایات اس بارے میں بڑی مختلف ہیں لیکن بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ جزیرۂ عرب میں دونوں ہی قسمیں موجود تھیں یہودی النسل لوگ بھی جو ترک وطن کر کے ادھر نکل آئے تھے اور عرب بھی جو یہودی بن گئے تھے۔ چنانچہ یاقوت اپنی معجم میں بیان کرتے ہیں کہ یثرب کے یہودی عرب ہی تھے جو یہودی بن گئے تھے۔ اغانی کے مصنف کا بیان ہے کہ جب تمام شام میں رومی قوم بنی اسرائیل پر غالب آ گئی تو انہوں نے ان کو بری طرح روندا اور قتل کیا۔ ان کی عورتوں سے شادیاں کریں تو بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو بہدل شام سے بھاگ کر حجاز میں چلے آئے تھے۔ ان بیانات میں کون سا بیان صحیح ہے۔ اس کی تحقیق کا یہ موقعہ نہیں۔

اگلے شمارے میں محترم پرویز صاحب کا خط
سلیم کے نام
ملاحظہ کیجئے

بزم طلوع اسلام

اس اشاعت کے ساتھ طلوع اسلام کو ہفتہ وار ہوئے تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ قارئین اپنے کام کی رفتار تیز کر دیں گے اور بزموں کی تشکیل و کارگذاری میں مستعدی سے کام لیں گے لیکن اس دو مہینے کے تجربے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین کا جمود ابھی ٹوٹا نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مقامی بزموں کی افادیت کو کما حقہ محسوس نہیں کیا گیا۔ اگر یہ صورت ہے تو اس مغالطہ کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ طلوع اسلام قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا کام کر رہا ہے۔ لیکن اس فکر کو افراد ملت کے دلوں میں جاگزیں کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف مقامات پر قارئین طلوع اسلام مل بیٹھیں اور کوشش کریں کہ مقامی حالات کے مطابق یہ پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری جگہوں کے قارئین سے بھی رابطہ پیدا کریں اور اس طرح اس فکر کی اساس پر ایک برادری قائم کرتے ہوئے حالات و ضرورت کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کریں تاکہ یہ آواز ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ جائے اسی غرض کے لئے جہاں کہیں بزم کی تشکیل ہوتی ہے اس کا پورا پتہ طلوع اسلام میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ قارئین کو چاہیئے کہ ان اطلاعات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور ہم خیال حضرات سے براہ راست رابطہ پیدا کریں۔

جمود کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جو بزمیں بنتی ہیں وہ ضروری کارروائی طلوع اسلام تک نہیں بھیجتیں یہ سہل انگارانہ روش بھی مستحسن نہیں کہلا سکتی۔ جہاں قارئین کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر ہم خیال میسر آنے پر بزم کی تشکیل کریں وہاں یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ اس کی تشکیل، ترجمان کے پتے اور معمولی اور ممکن کارگذاری سے ہمیں مطلع کیا جائے۔ کارگذاری کے متعلق یہ پابندی کرنی چاہیئے کہ ایک معین عرصے کے بعد (مثلاً ایک ہفتہ کے بعد، اگر ہفتہ واری اجتماعات کا انتظام ہے تو، ورنہ دو ہفتوں یا ایک مہینے کے بعد) ایک رپورٹ بھیج دی جائے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بزم کی تشکیل کے ساتھ "طلوع اسلام لائبریری" قائم کی جائے۔ اور اسے تمام سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بزم کے باقاعدہ اجلاس ہوں جن میں تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ اور مقامی حالات کے مطابق قرآنی شعور بیدار کرنے کی تجاویز پر غور کیا جائے اور عمل کی صورتیں پیدا کی جائیں تحریک طلوع اسلام جس مرحلہ میں ہے اس میں تمام کوششیں ہم خیال پیدا کرنے اور ہم خیالوں کو متحد و معاون بنانے پر مرکوز کرنی اور رکھنی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں جہد مسلسل سے ہی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت کام کا ہے آرام کا نہیں۔ لیکن اس سارے سلسلہ میں یہ نکتہ ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے کہ آپ کا کوئی قدم قرآن کے صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔

سیالکوٹ کی بزم نے ریلوے روڈ چوک گرین ڈاسٹرکٹ مقابل ٹیوب ویل میونسپل کمیٹی پر لائبریری کھولی ہے۔ گجرات کی نئی بزم کے ترجمان بابو محمد حسین صاحب شملہ اسٹور، چوک شاہ دولہ (گجرات) ہیں اور جھنگ مگھیانہ کے ظفر عباس قریشی صاحب (محلہ بھیرانہ لال دھرم شالہ جھنگ) ہیں۔ سرگودھا کی بزم نے طاہر العدوی صاحب کے مکان ملک محلہ جوئیاں پر لائبریری قائم کی ہے۔ بزم کا ہفتہ وار اجلاس بھی وہیں ہوتا ہے

قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن

(سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

قرآن کی حیثیت

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر اور اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے، انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں، اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا، بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان علینا للھدیٰ[1]

دین کے اصول

باقی رہے دین کے اصول تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں[2]۔ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا، یہ سب خداوند تعالیٰ کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے[3]۔ اس اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمان فارسی سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ۔

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا۔ اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو وہ معاف ہیں[4]۔

جزئیات کا تعین

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے۔ ان کے پاس نہ پھٹکو کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ[5]۔

ان دونوں حدیثوں میں سے ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے۔ اور ان کی تفاصیل نہیں بتائی یا جو احکام بسبیل اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا التعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی۔ تفصیلات بتانی چاہیئے تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ یہودیوں نے ایسا ہی کیا، جس کے نقش قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی[6]۔ آپ کی تشفی کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے[7]۔

فہم قرآن کے لئے حدیث کی ضرورت نہیں

قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہو۔ مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں[8]۔ قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں مگر ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو[9]۔

جزئیات میں تبدیلی ہو سکتی ہے

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے جو حالات عہد رسالت اور عہد صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے۔ لازم نہیں کہ بعینہ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو جوں کا توں تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ جس کو مزاج اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضا یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے۔ جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرز عمل سے اقرب ہو[10]۔

عہد صحابہ میں جزئیات میں تغیر و تبدل

زرعی قوانین مدون کرنے کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مزاج شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہوگی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائے گا اور ہر وقت پر اس کی بصیرت اس کو بتائے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل پیدا کیا جائے گا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہوگا۔ بلکہ اپنے محل خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ اتنا ہی بجا ہوگا۔ جتنا کہ خود شارع کا حکم ہوتا اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں مثلاً حضرت عمرؓ کا یہ حکم کہ دوران جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانہ میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شرع کے احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص شریعت کا مزاج داں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکم عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصود شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے کہ جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیا۔ پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپؓ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا اور ان کو بھوکا مار دیا۔ اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھا لے۔ تو اس کے لئے جائز ہو جائے یہ کہہ کر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقات ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے جو حکم صادر فرمایا۔ وہ عہد رسالت کے عمل درآمد سے مختلف تھا مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کئے گئے تھے اس لئے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ برخلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کرتا ہے اور مفضی الی الفساد ہو جاتا ہے[11]۔

اتباع رسول کا مفہوم

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر شکل میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے۔ اس سے رجعت کر کے اسی تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباع رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے۔ اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں ان کے نزدیک سلف صالحین کی پیروی اس کا نام ہے کہ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی ہم اس کو بالکل متحجر (FOSSILISE) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں۔ اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں۔ ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے

---

[1] رسائل و مسائل ص۲۶۸ [2] تفہیمات حصہ اول ص۳۲۹ [3] تفہیم القرآن ص۵۹۸ [4] تفہیمات حصہ دوم ص۳۰۹ [5] تفہیم القرآن ص۵۰۶ [6] تفہیم القرآن ص۵ [7] ترجمان القرآن اپریل، مئی ۱۹۵۲ء ص۱۰۲ [8] تنقیحات ص۱۰۳

دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانہ کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دین دار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہو رہا ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام سے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں۔ ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں[1]

اتباعِ رسول

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے۔ اور جس پر دین کا مدار ہے۔ یہ کس حیثیت سے ہے؟ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے۔ اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا ذاتی حق حاصل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے جو اصل ایمان ہے اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یک سر مو انحراف کا بھی حق نہیں وہ دراصل نبی بہ حیثیت انسان کے اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ اس علم، اس ہدایت اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں کو پہونچاتا ہے[2]

سنت کا مفہوم

دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور کے شخصی مزاج اور طبیعت پر مبنی تھیں کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ

تحریفِ دین

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کون سا جزو عادت، بغیر اس کے یہ ممکن نہیں کہ آدمی دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو[3]۔ نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانہ کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دین میں تحریف واقع ہوتی ہے[4]۔ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا یعنی رسم و رواج کو اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت ہے اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس کے برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے[5]

حدیث اور قرآن کا فرق

قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

احادیث سے یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں۔ جن سے حد سے حد کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم الیقین، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انھیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے مسلمانوں تک پہونچا دئیے گئے ہوں[6]

قول رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآن کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں، برخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول و فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضور کا ہے یا نہیں[7]۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے[8] اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے۔ وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے[9]

کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔ اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے ہیں یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟[10]

احادیث پر بالکلیہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا

ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور سیرت رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے۔ جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیت تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج سے اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے۔ اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے یہ اس لئے کہ اس کی روح روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی

---

[1] طلوع اور راہ ص ۹۵ [2] تفہیمات جلد اول ص ۹۳-۹۰ [3] رسائل و مسائل ص ۳۱۰-۳۱۱ [4] رسائل و مسائل ص ۳۱۰-۳۱۱ [5] رسائل و مسائل ص ۳۱۲ [6] رسائل و مسائل ص ۳۰۲ [7] رسائل و مسائل ص ۲۶ [8] رسائل و مسائل ص ۲۷۰ [9] رسائل و مسائل ص ۲۹۰ [10] تفہیمات حصہ دوم ص ۳۳۱ [11] تفہیمات ص ۳۰۲

سے اس کا مزاج اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے اس مقام پر پہونچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا وہ لبا اوقات ایک غریب، ضعیف منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس مادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور لبا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے۔ وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

احادیث دجال قیاسات ہیں

ان امور (احادیث دجال) کے متعلق جو باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ در اصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہو جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو۔ یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہیں۔[۱]

احادیث کے اختلاف کی وجہ

محدثین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں۔ انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں۔ ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں۔ رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں۔ انہیں گویا ایمان لے آئیں۔ ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں۔ اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سرمو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی شدت نے بہت سے کم علم لوگوں کو حدیث کی کلی مخالفت یعنی دوسری انتہا کی طرف دھکیل دیا ہے۔[۲]

محدثین پر کلیۃً اعتماد نہیں کیا جا سکتا

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے وہ بہر حال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں۔ ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں۔ وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی سمجھتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطہ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ اس لئے فقیہانہ نقطہ نظر سے جو قائم کرتے ہیں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انھوں نے کی ہیں۔ اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد دوسرے بلحاظ تفقہ۔[۳]

اسماء الرجال میں غلطیوں کے احتمالات ہیں

اس مطلب کی توضیح کے لئے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے۔ وہ کیسے لوگ ہیں؟ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے اس کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بد عقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلا شبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر اس میں کون سی چیز ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق صحیح علم ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے۔[۴]

محدثین کی چوٹیں اور فقرہ بازیاں

حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔" عطاء اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابو حنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھئے، اپنے زمانے کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں ما رایت قوما انقض لعری الاسلام من اھل مکۃ حالانکہ کہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجے کے لوگ ہیں مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح کو لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے: ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے۔ حالانکہ مسروق سے وہ ملا تک نہیں۔ ضحاک کو دیکھئے ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں۔" سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں۔ اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ "لا تکذب علی کما کذب عکرمۃ علی ابن عباس"۔ امام مالک کی جلالت شان دیکھئے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمان دیکھئے۔ "ذلک دجال من الدجاجلہ"۔ اس سے عجیب تر یہ ہے۔ کہ وہ تمام علماء عراق پر سخت طعن کرتے ہیں۔ اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ "انزلوھم منزلۃ اھل الکتاب لا تصدقوھم ولا تکذبوھم"۔ امام ابو حنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ "اس نے کبھی رمضان کا روزہ رکھا۔ نہ غسل جنابت کیا"۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش "انما من الماء" اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن المبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی غضب نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا۔" یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے آفات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابو عثمان النہدی، طاؤس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انھوں نے کہا کہ "لیس بثقۃ"۔[۵]

صحابہ بھی بشری کمزوریوں کا شکار تھے

ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ لبا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔[۶] ابن عمر نے سنا کہ ابو ہریرہ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے ابو ہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول کو کیا جانیں وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے؛ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ "وشاھد ومشھود" کے معنی پوچھے۔ انھوں نے اس کی تفسیر بیان کی عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقعہ پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ وہ بدری صحابی ہیں۔[۷]

بشری غلطیاں

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں پھر ایک ایک راوی کے حافظ اور اس کی نیک

۱ے رسائل و مسائل ص۵۵-۵۶ ۲ے تفہیمات حصہ اول ص۳۱۸ ۳ے تفہیمات حصہ اول ص۳۱۹ ۴ے تفہیمات ص۳۱۹ ۵ے تفہیمات ص۳۲۱ حصہ اول ۶ے رسالہ معاذ اللہ طلوع اسلام، ۷ے تفہیمات حصہ اول ص۳۲۱

نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے۔ اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیات کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

راویوں سے غلطیاں ہوجایا کرتی تھیں

یہ تو فن رجال کا حال ہے اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے .... یا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں اور ملا تھا تو اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سن لی۔ اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اس حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے مگر لازم نہیں کہ ہر ہر روایت میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہوگئے۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انھیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں۔ اور اس بنا پر پایہ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔[ب]

فقہا نے حدیث کے خلاف فتوے دیئے

امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے۔ مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل پر ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتوے دینے پر مجبور کیا جنھیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ستر مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔[ج]

حاصل بحث

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیۃً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔[د]

طلوع اسلام

یہ مضمون مولانا مودودی صاحب کی تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں تمام الفاظ انہی کے ہیں بجز ان کے جو خطوط وحدانی میں ہیں۔ .... احادیث کے متعلق بعینہٖ یہی مسلک طلوع اسلام کا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ کسی ایک فرد کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ جس بات کو اس کی نگاہ جوہر شناس سنت رسول قرار دے اس کی اتباع ساری امت پر لازم قرار پاجائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ حق صرف امت کے قرآنی نظام کو حاصل ہے کہ وہ روایات کے اس ذخیرہ کو چھان پھٹک کر دیکھے کہ اس میں کون سی چیز صحیح ہو سکتی ہے اور کون کون سی جزئیات ایسی ہیں کہ جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ دیکھیے کہ اس کے باوجود جماعت اسلامی طلوع اسلام کو مسلسل اور پیہم منکر حدیث اور منکر شان رسالت ٹھہرا کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی رہتی ہے اور اپنے امیر کو حدیث کا سب سے بڑا حامی اور سنت کا جید متبع قرار دیتی ہے۔ اس کے جواب میں جماعت اسلامی والے کہیں گے کہ یہ اقتباسات مودودی صاحب کی تحریروں سے توڑ مروڑ کر لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم آپ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ ان کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان خود کر لیجئے کہ اقتباسات سیاق و سباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں۔ سچ اور جھوٹ خود سامنے آجائے گا۔

ہمت ہو پر کشا تو ......

سطح بین نگاہیں زندگی کی بے پایاں وسعتوں کو سماعت، بصارت، گویائی جیسے حواس تک ہی محدود دیکھتی ہیں۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ جب زندگی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی پیکر آدم میں نمودار ہوئی تو اس میں ایک ایسا انقلاب آیا جس کا نشان تک زندگی کی نچلی سطح میں نہیں تھا۔ یہ انقلاب انسان کی ذات (PERSONALITY) کا مظہر تھا جس کی نمود انسان کے عزم و ارادہ سے ہوتی ہے۔ جس قدر پختہ عزم اتنی ہی مستحکم انسانی خودی، ویسے تو انسانی عزم کے نمود، آثار و مظاہر بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اس کی نمود اس شدت اور تابندگی سے ہوتی ہے کہ انسان محو حیرت رہ جاتا ہے کہ ممکنات زندگی کی پہنائیاں کس قدر حدود فراموش ہیں۔

اگر زندگی کی بے پناہ قوت کان، آنکھ زبان تک ہی محدود ہوتی۔ تو آج دنیا ہیلن ایڈمز کیلر (HELLEN ADAMS KELLER) کا نام بھی نہ جانتی۔ اور نام جانتی بھی کیا وہ شاید ہمیشہ کے لئے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی۔ لیکن۔

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

اور ملک خدا کی وسعت کا پیمانہ کسی گدا کا لنگڑا پاؤں نہیں ہے بلکہ زدجری کے عزم و ہمت سے ہوتا ہے جو قدم قدم پر اقدار انسانیہ کے تازہ جہان آباد کرتا جاتا ہے۔ مس کیلر اس کی زندہ مثال ہے۔ مس کیلر ایک اندھی اور بہری عورت ہے جو تہتر سال سے اندھی اور بہری چلی آرہی ہے۔ یہ تہتر سال ثبوت ہیں اس حقیقت کبریٰ کا کہ جب زندگی اپنی نمود چاہتی ہے تو حواس ظاہری سے محرومی اس عمل کو نہ روک سکتی ہے نہ دار گوں کر سکتی ہے بلکہ وہ عمل کے لئے مہمیز بن جاتی ہے۔

موصوفہ، ۲۷ جون سنہ ۱۸۸۰ء کو ٹسکمبیا (امریکہ) میں پیدا ہوئی۔ وہ ابھی بمشکل انیس مہینے کی ہوئی تھی کہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر بصارت اور گویائی سے محروم ہوگئی۔ بچے اندھے ہوجاتے ہیں۔ اندھے پیدا بھی ہوتے ہیں (اور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ دیکھتے نہیں۔ وہ اندھے ہی نہیں ہوتے اوروں کو بھی اندھا کرتے ہیں) لیکن تین چوتھائی صدی ادھر کون کہہ سکتا تھا کہ ان گنت اندھوں میں سے یہ حقیر و ناتواں بچی جو خود بولنے اور دیکھنے کی نعمتوں سے محروم ہو چکی تھی دنیا کے معذور انسانوں کے لئے آیۂ رحمت بن جائے گی۔ وہ ہمدردی، خدمت اور محبت کی قندیلیں لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرے گی اور اس کرۂ ارض کو منور کرتی جائے گی۔

کیلر چھ سال کی عمر کو پہونچی تو اس کے والدین نے مس این مینسفیلڈ سلیون کو (جو بعد میں شادی کر کے مسز جان میسی مشہور ہوئیں) بچی کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ مس سلیون کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ وہ خود اندھی ہوگئی تھی لیکن علاج سے اسے روشنی کی چند کرنیں میسر آگئی تھیں وہ بوسٹن کی اندھوں کی پرکنز انسٹی ٹیوٹ کی فارغ التحصیل تھی۔ کیلر اس وقت تک اندھی اور بہری ہی نہیں تھی۔ گونگی بھی تھی۔ لیکن مس سلیون نے ایک ہی مہینے میں اپنے شاگرد کو بولنا سکھا دیا۔ مس سلیون کی نگرانی میں اندھوں، بہروں کے اسکول میں داخل ہو کر کیلر نے لکھنا پڑھنا اور بولنا ہی نہ سیکھا بلکہ تعلیم میں غیرمعمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں اس نے اپنے سوانح حیات لکھی اور سنہ ۱۹۰۳ء میں "رجائیت" (OPTIMISM) کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ اس کے بعد کم از کم چار کتابیں اور تصنیف کیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں وہ گریجویٹ بن گئی۔ سلیون اور کیلر کا جوڑا خوب تھا۔ ایک اعلیٰ استاد تھی۔ تو دوسری عمدہ شاگرد۔ دونوں نے مل کر ایک نئی دنیا تعمیر کرلی۔ ان کا ساتھ سنہ ۱۹۳۶ء میں ٹوٹا۔ جب مس سلیون کا انتقال ہوگیا۔

کیلر کی زندگی۔ اندھوں، بہروں، گونگوں اور معذوروں کے لئے وقف ہے۔ اس نے اندھے اور گونگے پن سے جو کچھ کھویا اس سے کہیں زیادہ محنت شاقہ اور بے پناہ جذبات ہمدردیٔ نوع انسانی سے حاصل کیا۔ یہ اس کی دولت ہے جسے وہ دنیا بھر میں لٹاتی پھرتی ہے۔ ان دنوں وہ عالمی دورے پر ہے۔ یہ دورہ فروری میں شروع ہوا تھا اور ۲۳ جون کو اس کی پچھترویں سالگرہ سے چار روز پیشتر ختم ہوگا۔ اس چالیس ہزار میل کے دورہ میں وہ پاکستان، ہندوستان، برما، فلپائن اور جاپان کا چکر کاٹے گی تاکہ ان ممالک کی حکومتوں اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اندھوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں۔ جس سے وہ آزادی اور مسرت کی زندگی گذار سکیں۔ ان علاقوں میں اس کے اندازے کے مطابق کوئی ایک کروڑ اندھے ہیں۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہی فضا سازگار کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس کے لئے بھی کوشاں ہے کہ قابل علاج، اندھاپن عدم توجہی یا ذرائع کی کمی سے مستقل نہ ہوجائے۔ یہ دورہ تبھی نہیں بلکہ امریکہ کے اس ادارے کی طرف

ہے جو مستمند اپاہج کے اندھوں کی خدمت کے لئے بنایا گیا ہے محض یہی تصور کچھ کم خوش آئند نہیں کہ ایک ملک دوسرے ملک کے معذوروں کے لئے امدادی ادارہ قائم کرے لیکن اس پر مستزاد کیلر جیسے کارکن کا وجود ہے جس کی زندگی کا مقصد معذوروں کی خدمت ہے۔

کیلر کو ہوائی سفر کا بہت شوق ہے اور وہ ہوائی جہاز میں خاص لذت محسوس کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے سیارات کے بازؤں پر چڑھنا ایک عجیب تجربہ ہے مجھے اپنے آگے اور پیچھے خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور میں پھر کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ

بس دولۂ شوق ہے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

مسز روزویلٹ نے حال ہی میں کیلر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔

تم جہاں کہیں بھی جاتی ہو وہاں کے لوگوں کی ضروریات کو جانتی ہو اور ان کے مصائب کو سمجھ کر ان کا مناسب مداوا کیا کرتی ہو۔ تمام انسان تمہارے خاندان کے افراد ہیں۔ اور تم خود دنیائے انسانیت کا حصہ ہو۔

اس سال ۲۷ جون کو کیلر کی عمر ستر سال ہو جائے گی۔ اس عمر میں جہاں عام طور پر آرام کرنے اور اللہ اللہ کرنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے دنیا میں کشاں کشاں پھر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ اس کا جذبہ خدمت بڑھتا جا رہا ہے۔ کس قدر صحیح کہا ہے اقبال نے کہ

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

عربی اخبارات و رسائل

طلوع اسلام کے پروگرام میں یہ بھی ہے کہ اہل پاکستان کو دیگر اسلامی ممالک کے کوائف اور تحریکات سے باخبر رکھا جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ان ممالک کے اعلیٰ پایہ کے اخبارات اور رسائل منگائے جائیں۔ ہم نے اس ضمن میں مختلف اسلامی ممالک کے قونصل خانوں کو جو کراچی میں واقع ہیں لکھا کہ وہ مناسب اخبارات کی نشاندہی کریں، اور یہ بھی بتائیں کہ ان اخبارات کو قیمتاً منگانے کا آسان طریقہ کیا ہے۔ ان میں سے (ایک آدھ کے سوا) کسی کا بھی جواب نہ آیا۔ اس پر ہم نے ایسے اخبارات کی فہرست خود ہی مرتب کی۔ اور ان کے دفاتر کو لکھا کہ وہ ان اخبارات کو ہمارے نام جاری کر دیں۔ اور ان کی قیمت ہم سے وصول کر لیں۔ اس کے جواب میں زیادہ وقت کے باوجود ہم کو ایک سے نہیں سے جواب آیا ہے نہ کوئی اخبار یا مجلہ۔ اگر قارئین طلوع اسلام میں سے کوئی صاحب اس باب میں ہماری مدد کر سکیں، تو ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔ یعنی وہ اس کا انتظام کر دیں کہ ہمیں ایران عراق، سعودی عرب، شام، مصر، مراکش وغیرہ کے مشہور روزنامے، ہفت روزہ اخبارات اور رسائل (جن کی فہرست ہم دیدیں گے) باقاعدہ مل جائیں۔

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز صاحب۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ دنیا عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مطبوعہ اور حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم — از پرویز صاحب۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق ✽ قصۂ آدم ✽ ابلیس ✽ جنات ✽ ملائکہ ✽ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات — قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۳۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز صاحب۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے سانحہ اہم مسائل؛ معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ چار سو آٹھ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز صاحب۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمیں کیا مرض لگا ہے اور علاج کیا ہے؟ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سچی ہولناک تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز صاحب۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز صاحب) مسلمان کے عادات و خصائل کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر پہلو قرآن آئینہ میں۔ صفحات ۲۹۲۔ قیمت دو روپے

نوٹ

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳۔ کراچی

چارہ ساز

چارہ مویشیاں کی قابل اعتماد آڑھت کی دکان

محمد سعید اینڈ کمپنی

۱۸۔ ٹوپن داس بلڈنگ۔ بادشاہی روڈ۔ کراچی

NIAZ HOSIERY MILLS
INTERLOCK
TRADE MARK
KARACHI
MADE IN PAKISTAN

باب المراسلات

شب برات شب برات پھر آرہی ہے اور اس کے متعلق پھر استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ یہ کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے، اور اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟ جیسا کہ طلوع اسلام میں اس سے پہلے بھی لکھا ہے اور قرآنی فیصلے میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے، یہ تیوہار نہ کسی واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی دینی حیثیت ہے بس ایک رسم ہے جو متواتر چلی آرہی ہے اس کی بنیاد بھی بعض وضعی احادیث پر ہے۔ چنانچہ شیخ محمد طاہر کے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں (مثلاً ابو طالب مکی کی قوت القلوب) یا ثعلبی وغیرہ کی تفاسیر سے جنھوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر سمجھ لیا۔ لوگوں نے صلوٰۃ الفیہ جاری کر دی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگ گئے یہاں تک کہ اس نے ایک میلے کی شکل اختیار کر لی۔ سب سے پہلے اس کا رواج ۴۴۸ھ میں بیت المقدس میں ہوا۔ پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتدا برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے انھوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم تازہ کی۔ اس نے رفتہ رفتہ آتشبازی کی شکل اختیار کر لی جو مشرق سے مغرب تک پھیل گئی۔ اور یوں شب برات وجود میں آگئی۔

یہ ہے اس تیوہار کی "دینی حیثیت"!

ریڈیو اور قرآن رسالپور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ واری قرآن کے خطبات کے متعلق آپ نے اس تجویز سے اتفاق کیا ہے کہ انھیں طلوع اسلام میں بھی شائع کیا جائے۔ لیکن میری تجویز یہ ہے کہ اگر ان خطبات کو ریڈیو سے براڈکاسٹ کیا جائے تو ان کی افادی حیثیت بہت بڑھ جائے۔

طلوع اسلام: اجی حضرت! آپ کس دنیا میں بس رہے ہیں؟ ریڈیو پاکستان اور اس سے قرآن کی تعلیم کا نشر ہونا؟ ایسا ہو گیا تو قیامت آجائے گی۔ ہمارے ریڈیو سے خیر سے نشر ہوں گے طلسم ہوشربا کے افسانے اور امیر حمزہ کی داستانیں۔ جن کی ابتدا قرآن کی کسی آیت سے اسی طرح تبرکاً کر دی جائیگی جس طرح ہم خطوں کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیتے ہیں اور اس ۷۸۶ کو خط کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ریڈیو کا مقصد عوام کو خوش رکھنا ہے نہ کہ ان کی ذہنی اور فکری تربیت کرنا۔ عوام کو خوش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انھیں مذہب کے نام پر کچھ کھلونے دیتے چلے جائیں۔ جس سے ان کا جی بہلتا رہے۔ ہمارے مولوی اور واعظ کے پاس ان کھلونوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے! اس لئے ریڈیو پر "درس قرآن" کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے عوام بھی راضی رہتے ہیں اور مولوی صاحبان بھی خوش! اگر ریڈیو پر خالص قرآن کے حقائق بیان ہونے شروع ہو گئے۔ تو اس سے قوم میں اسلامی روح بیدار ہو جائے گی۔ اور اسلامی روح کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ کس قدر خطرناک ہوتی ہے — موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ریڈیو سے قرآن خالص کے حقائق نشر ہوا کریں۔ تو آپ ملک کی فضا میں اس طرح قرآن کو عام کر دیجئے کہ لوگ ان حقائق کے علاوہ اور کسی چیز سے مطمئن نہ ہوں اور اس طرح ان کے تقاضے اس قدر بڑھ جائیں کہ ریڈیو والے قرآن نشر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

زندگی کا منتہیٰ مظفر گڈھ سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ زندگی کو جوئے رواں بتاتے ہیں لیکن اس کا آخر کیا ہے۔ کیا یہ ایک دائرے کی صورت میں چکر لگاتی رہے گی۔ یا کچھ اور ہے؟

طلوع اسلام زندگی کے منتہیٰ کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ نہ ہی یہ بات آج ہمارے شعور کی موجودہ سطح کی رو سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ البتہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ زندگی میں رجعت نہیں۔ اس لئے دائرے کی شکل میں چکر لگانے کا تصور غلط ہے۔ زندگی حرکت دوری نہیں یہ ایک صراط مستقیم پر آگے بڑھتی ہے اور طبقاً عن طبق بلند ہوتی چلی جاتی ہے

(نوٹ) استفسار بھیجتے وقت قارئین کو پورا پتہ ضرور تحریر کرنا چاہیئے کیونکہ بعض استفسارات ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب رسالہ میں دینے کی بجائے انفرادی طور پر دینا بہتر ہوتا ہے لیکن پتہ موجود نہ ہونے کی صورت میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ — مدیر

حقائق وعبر

وزیر اعظم اور درویش معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعظم محمد علی نے اپنے پانچ روزہ قیام ڈھاکہ کے دوران ایک درویش سے خفیہ ملاقات کی تھی جو سلہٹ سے ڈھاکہ آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم نے بنگال میں وزارت سازی کے سلسلہ میں اس درویش سے مشورہ کیا تھا۔ بعد میں جب یہ درویش واپس گئے تو ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن پر اعلیٰ حکام اور وزیر اعظم کے ذاتی عملہ کے ارکان نے انھیں الوداع کہا۔ وزیر اعظم کے اپنے دو آدمی بھی اس درویش کے ساتھ چار نشستوں والے ایک اعلیٰ کلاس کے ڈبہ میں گئے۔ اس سفر کے تمام اخراجات وزیر اعظم نے خود برداشت کئے (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۵۵ء)

اس سے پہلے اتنا ہی سنا تھا کہ بڑے بڑے لوگ سٹہ کا نمبر دریافت کرنے کے لئے فقیروں کے ہاں جاتے ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اور اب امور سلطنت کے لئے بھی انہی بارگاہوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے لب حافظ کو شکایت نہیں رہے گی کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

تاریخ شاہد ہے کہ جب حکومتوں کے فیصلے خانقاہوں سے ہونے لگے تو سلطنتیں مٹنا شروع ہو گئیں حقیقت یہ ہے کہ انسان خانقاہوں کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب وہ عمل سے بیگانہ اور جد و جہد کے نتائج سے مایوس ہو جاتا ہے۔ بہر حال اب بھی اگر کسی کو مملکت پاکستان کے "اسلامی" ہونے میں شبہ ہو تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

جذبۂ خدمت اسی اشاعت میں آپ کو مس کیلر کے متعلق ایک مضمون ملے گا جس سے پتہ چلے گا کہ خدمت خلق کا جذبہ انسان کے کردار میں کیا تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اب اس کا دوسرا رخ دیکھئے۔

معاصر "ٹائمز آف کراچی" کا ایک کالم نویس لکھتا ہے:-

اگر اخبار نویس اور اخباری فوٹوگرافر نہ ہوں تو آجکل کی تقریبات بڑی حد تک کم ہو جائیں۔ مجھ سے ایک لیڈی رپورٹر نے ذکر کیا کہ لاہور کے ایک زنانہ کلب نے ایک مرتبہ اسکول کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے تصاویر کھینچنے کا انتظام ان لیڈی رپورٹر کے سپرد کیا (اتفاق سے) فوٹوگرافر وقت پر میسر نہ آسکے چنانچہ مٹھائی تقسیم کرنے والیاں چار گھنٹے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ بالآخر فوٹوگرافروں کے پہونچنے پر پچاس روپے کی مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اور پہلو بدل بدل کر تصویریں کھنچوائی گئیں۔ ان تصویروں پر فوٹوگرافروں کے کوئی ایک سو روپے خرچ ہو گئے۔ لیکن اس کی تلافی ہو گئی کیونکہ تصویریں کھنچوانے والیوں نے دو سو روپے کی تصویریں ان سے خرید لیں۔

انہی دنوں مرکزی حکومت نے ماتحت حکومتوں کو ہدایت بھیجی ہیں کہ وہ تقریبات اور ضیافتیں کم کر دیں لیکن ہم نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ اس قسم کی ہدایات بھی جاری ہوئی ہوں کہ منسٹروں کے ساتھ پبلسٹی افیسر اور فوٹوگرافر دوروں میں نہ جایا کریں۔ اس لئے کہ اگر پبلسٹی ہی نہ ہوئی تو وزارت کس کام کی؟

لیکن ہمیں سب سے زیادہ تعجب اپنے اخبارات پر آتا ہے۔ یہ ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ارباب حکومت کفایت شعاری نہیں کرتے۔ لیکن یہ اتنا نہیں سوچتے کہ اس میں خود ان کا اپنا ہاتھ کس قدر ہے۔ اگر ہمارے اخبارات ان حضرات کی مختلف تقاریب کی روئداد شائع کرنا بند کر دیں تو یہ تقریبیں خود بخود ختم ہو جائیں۔ لیکن پھر یہ اخبار والے دعوتیں کہاں سے کھائیں؟

عالمِ اسلامی

مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم جس کا سنگِ بنیاد پاک ترکی معاہدے کی صورت میں رکھا گیا اور جس کا دوسرا قدم ترکی عراقی معاہدہ ہے اب ایک یقینی منزل میں داخل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان، ترکی، عراق، ایران، برطانیہ اور امریکہ عنقریب ایک دفاعی سلسلہ میں منسلک ہو جائیں گے اس ضمن میں متعلقہ دارالخلافوں میں ضروری تیاریاں ہو رہی ہیں امریکہ اس معاملہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے سب سے قابلِ فہم مشرقِ وسطیٰ میں اس کے یقینی حلیف، پاکستان، عراق اور ترکی ہیں تینوں نے اس سے عسکری معاہدہ بھی کر رکھا ہے ایران کی ہمدردی بھی امریکہ کے ساتھ ہے۔ لیکن امریکہ کو مصر اور اسرائیل کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ یہودیوں کو مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں شریک نہیں کر سکتا لیکن انھیں یہ تسلی ضرور دینا چاہتا ہے کہ انھیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ لہٰذہ وہ اس سے علیحدہ معاہدہ کر لینا چاہتا ہے۔ مصر کے معاملہ میں امریکہ کی کوشش تو یہ ہے کہ وہ براہِ راست دفاعی تنظیم میں شامل ہو جائے لیکن مصر نے جو رویہ پیدا کر لیا ہے، اس کے پیشِ نظر فی الحال اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ لہٰذہ مصر کے پاس خاطر سے امریکہ اس تجویز پر غور کر رہا ہے کہ وہ اس سے علیحدہ معاہدہ کر لے اور خود مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم یعنی میڈو[1] میں شریک ہو جائے۔ تاکہ مصر اس طرح بالواسطہ میڈو سے وابستہ ہو جائے۔ یہ تجاویز ابھی موزوں ہو رہی ہیں لیکن توقع ہے کہ جلد ہی یہ واضح ہو کر سامنے آ جائیں گی اور ان پر عمل درآمد کیا جا سکیگا۔

مصر کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس قسم کے انتظام پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ اس کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔ ۱۸ مارچ کو مصری وزیر میجر صلاح سالم نے ایک بیان میں کہا کہ نجب یعنی فلسطین کا جنوبی علاقہ جہاں ان دونوں مصر اور اسرائیل میں چپقلش ہوئی۔ مشرقِ وسطیٰ کے دفاع کی کلید ہے کیونکہ یہی وہ علاقہ ہے جو سوئز کے دفاعی مستقر کو عرب ممالک سے ملاتا ہے جب تک یہ علاقہ مصر کو نہیں مل جاتا کوئی دفاعی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان کے بیان کا یہ حصہ معنی خیز ہے۔ "اقوامِ مغرب یہ چاہتی تو ہیں کہ مصر علاقائی دفاعی تنظیم میں شامل ہو جائے لیکن وہ نہیں سمجھتیں کہ جب تک سوئز اور ترکی میں مواصلات نہیں ہوں گے۔ شمال سے ہونے والے حملہ کا تدارک نہیں کیا جا سکیگا۔ اور سوئز ہی وہ اہم اڈہ ہے جہاں سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصر کو میڈو کی شرکت پر کوئی اصولی اعتراض نہیں رہا بلکہ بعض عملی مشکلات اس کے پیشِ نظر ہیں اگر مصر حقائق کو واقعی یوں بے نقاب دیکھ سکتے تو ممالکِ اسلامیہ کے اتحاد کی فوری شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مصر اور شام کا رویہ عراق کے معاملہ میں معتدل بلکہ دوستانہ ہو رہا ہے جو شامی سرکاری وفد بغداد گیا تھا وہ مطمئن واپس آ گیا ہے اور اسے یقین ہو گیا ہے کہ عراق عربی مفاد کو پسِ پشت نہیں ڈالے گا۔ مصر میں بھی عراق کی مخالفت کم ہو گئی ہے کیونکہ اسے اس کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ عراق کو علیحدہ کر کے عربی وحدت برقرار نہیں رکھ سکیگا۔ اور اس میں اس کا نقصان ہوگا۔ چنانچہ قاہرہ سے بھی یہ اعلانات ہوئے ہیں کہ عراق عرب لیگ کے لائحہ عمل پر کاربند رہے گا۔

شمالی افریقہ کے مسلمانوں کا ابتلا ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ آزادی کی ابتدائی مراعات حاصل کرنے کیلئے بھی ان بیچاروں کو ابھی بہت قربانی دینا ہوگی ہو کیوں نہ، وہ قریباً تنہا لڑ رہے ہیں مسلمان ممالک ان کی ہمدردی کا دم ضرور بھرتے ہیں لیکن عملاً ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے۔ اگر اب بھی مسلمان ممالک متحد ہو جائیں تو وہ ان مظلومین کو آزادی سے ہمکنار کرنے کیلئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ فرانس نے تیونیشیا سے پھر سے مذاکرات شروع کر دیئے ہیں لیکن الجیریا کا معاملہ معلق ہے۔ وہ وہاں بدستور جبر و تشدد سے کام لے رہا ہے۔ اس علاقہ میں نومبر ۱۹۵۴ء سے خاص طور سے ہنگامے ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس نے تیونیشیا سے تو داخلی خود مختاری کا وعدہ کیا تھا لیکن الجزائر اور مراکش کے لئے کچھ نہ کیا حالانکہ سب کا معاملہ یکساں ہے چنانچہ اب فرانس نے الجزائر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فرانس آزادی کے سیلاب کے سامنے بند باندھ سکتا ہے جس طرح اسے ہند چینی سے نکلنا پڑا ہے اسی طرح یہاں سے نکلنا ہوگا فرق صرف یہ ہے کہ ہند چینی کو سرخ چین کی امداد حاصل تھی لیکن مغربِ اقصیٰ والے بے یار و مددگار ہیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آزادی کا جذبہ جب بیدار ہوتا ہے تو وہ طاقتور سے طاقتور حکومت کو بھی تختہ الٹ کر رکھ دیتا ہے۔

بین الاقوامی جائزہ

اس وقت انسان ہلاکت کی ایسی وادی میں داخل ہو چکا ہے جس سے بظاہر کوئی رجعت یا مفر نہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہاں سے انسان کہاں جائے گا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ایک عجیب ہول اور بیچارگی کا عالم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

انسان کو وادیٔ موت میں لا کھڑا کرنے والی چیز اس کی اپنی سائنسی ترقی ہے۔ سائنس نے اسے محیر العقول طاقت عطا کر دی ہے۔ لیکن انسان کا وحی سے بیگانہ ذہن، اس کا اس سے بہتر استعمال نہیں سوچ سکتا کہ اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ایٹم بم کی ایجاد سے بیشتر سوال محض یہ تھا کہ ایسے تباہ کن اسلحہ تیار کر لئے گئے ہیں اور کہے جا رہے ہیں کہ اگر جنگ ہو گئی تو دنیا میں ایسی ہلاکت پھیلے گی۔ جس کی نظیر تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی۔ لیکن پہلے ایٹم بم اور بعد میں ہائیڈروجن بم نے ایک نئی مصیبت برپا کر دی ہے۔ اب انسان کو تباہی کے لئے جنگ کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس وقت جو ایٹمی تجربے ہو رہے ہیں۔ انہی سے فضائے عالم میں ایسا تابکار زہر (RADIO ACTIVE POISON) پھیل جائے گا کہ ایک وقت کے بعد بغیر جنگ کے انسان اور اس کی تہذیب معدوم ہو جائے گی۔ ایک سائنسدان نے کہا ہے کہ انسانی جسم پر اس زہر کا جو تدریجی اثر ہوگا۔ وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا جائے گا۔ تا آنکہ کسی متنفس کی افزائش بلکہ زندگی ناممکن ہو جائے گی۔

شاید اقبال نے اس شعر میں اسی دور کی تصویر پیش کی ہے۔

دلِ گیتی انا المسموم انا المسموم فریادش
خرد گوید کہ اے سندی بہ تریاقے دلا راقی

خردمندانِ مغرب ہائیڈروجن بم کے منحوس سائے میں لندن میں ۲۵ فروری سے جمع ہیں۔ تاکہ اسلحہ کی تحدید کی کوئی صورت پیدا کریں گو تفصیلات منظرِ عام پر نہیں آئیں تاہم وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ یہ حیران کن نہیں۔ ایسے مذاکرات جنگ کے خاتمے کے بعد شروع ہوئے تھے۔ لیکن اب تک ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اقوامِ مغرب کی طرف سے جو تجویز پیش ہوتی ہے۔ اسے روس مسترد کر دیتا ہے۔ اور جو کچھ روس کہتا ہے، اسے اقوامِ مغرب نہیں مانتیں۔ اور حال یہ ہے کہ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ ایٹمی اسلحہ کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جائے۔ روس ایٹمی اسلحہ کے لحاظ سے امریکہ سے پیچھے ہے لیکن اس کی فوج زیادہ ہے۔ لہٰذہ وہ ایٹمی اسلحہ کو فی الفور ممنوع قرار دے کر افواج ایک تہائی کم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے جب ایٹمی اسلحہ کی ممانعت ہو گی تو امریکہ کی روس پر برتری ختم ہو جائیگی۔ اور افواج کم کر دی گئیں تو عسکری اعتبار سے روس کی برتری یقینی ہو جائے گی۔ ان حالات میں یہ یقینی ہے کہ موجودہ مذاکرات بے نتیجہ ثابت ہونگے۔

ادھر یہ مذاکرات ہو رہے ہیں ادھر اقوامِ مغرب نے ایک اہم موڑ مڑا ہے۔ معاہداتِ پیرس فرانس کی سینیٹ نے بھی منظور کر لئے ہیں گویا اب مغربی یورپی یونین کی بنیاد پڑ جائے گی اس تصدیق کا اثر مغرب اور مشرق کے تعلقات پر بھی پڑے گا روس نے بڑی کوشش کی کہ یہ تصدیق نہ ہو سکے لیکن وہ ناکام رہا وہ اقوامِ مغرب کو مشترکہ کانفرنس کی دعوت دیتا رہا لیکن ادھر سے یہی جواب ملتا رہا کہ معاہداتِ پیرس کی تصدیق کے بعد ایسی کانفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔ فرانس اور برطانیہ ایسی کانفرنس کے حق میں تو تھے ہی اب امریکہ بھی اس کا قائل نظر آتا ہے گو اسے اپنے حلیفوں سے تھوڑا سا اختلاف ہے ۲۳ مارچ کو صدر آئزن ہاور نے کہا کہ گذشتہ دو سال میں روس میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ نئی روسی قیادت سے تمہیدی گفتگو ہی رنگ لائیگی۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ رئیسانِ مملکت کی بجائے دوسرے نمائندے آپس میں ملیں اور اگر اس طرح بات آگے بڑھائی جا سکے تو وہ دنیا کے کسی کونے میں اس کے لئے جانے کے لئے تیار ہوں گے۔

خرد کی قوت اور اس کے ساتھ ہی اس کی بے چارگی جس حد تک اس دور میں پہنچی ہے آسمان کی آنکھ نے اس سے پہلے شاید ہی یہ نقشہ دیکھا ہو۔ کیسا عجیب ہے یہ تضاد لیکن کس قدر مبنی علی الحقیقت!!

[1] میڈو MIDDLE EAST DEFENCE ORGANISATION · M.E.D.O

دفتری بدنظمیاں

مندرجہ بالا عنوان کے تحت طلوعِ اسلام کے لمعات میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اسے نہایت دلچسپی سے پڑھا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہمارے پاس بہت سی تجاویز اور بہت سے مشورے آ رہے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ طلوعِ اسلام میں دفتری بدنظمیوں کے لئے ایک جداگانہ باب کا اضافہ کیا جائے۔ اس باب میں عام اخباری انداز کے مطابق پگڑیاں اچھالنے یا تنقید برائے تنقید سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ نہایت سنجیدہ اور اصولی طور پر کوشش کی جائے کہ حکومت کی مشینری میں جہاں جہاں قابلِ اصلاح نقائص ہوں انہیں نمایاں کیا جائے اور حتی الامکان ان کی اصلاحی تدابیر پیش کی جائیں۔ اسی طرح جہاں جہاں قابلِ ستائش اقدامات نظر آئیں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاکہ دوسرے لوگوں میں ان کی تقلید کا جذبہ پیدا ہو۔ اس سلسلہ میں قارئین طلوعِ اسلام کا عملی تعاون ہمارے لئے شکریہ کا موجب اور مملکت کی بہی خواہی کا باعث ہوگا۔ آپ کو جہاں جہاں کوئی انتظامی خرابی نظر آئے۔ اس سے ہمیں مطلع کیجئے۔ لیکن اس کا خیال رکھئے کہ آپ کی تنقید ذاتی ہو نہ تخریبی بلکہ وہ اصولی اور تعمیری ہو۔ اس کی بھی احتیاط برتئے کہ واقعات میں کوئی غلطی نہ ہو۔ مراسلہ میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھئے اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا نام شائع کر دیا جائے گا۔ ورنہ اسے اپنے تک محدود رکھا جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ آپ کی شکایت یا تنقید اسی جیسی ہو گی۔ دیانت اور غیر جانبداری کی آئینہ دار ہونی چاہیئے جو طلوعِ اسلام کی خصوصیات ہیں۔

اس سلسلہ کی ابتداء ڈھاکہ کے ایک مراسلے سے کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۹ مارچ کا شمارہ زیرِ نظر ہے اداریہ "دفتری بدنظمیاں" ایک قومی فریاد ہے۔ میں گزشتہ بیس سال سے اس پر غور کر رہا ہوں کہ حکومت کے دفاتر تجارتی دفاتر کے اصول پر کیوں نہیں چلائے جا سکتے۔ لیکن تقلید کا جو بوسیدہ غلاف ہماری اجتماعی زندگی پر چڑھا ہوا ہے۔ اس سے ہمارے دفاتر مستثنیٰ کیوں ہوں حالانکہ وہی قوم (انگریز) جس نے یہ طریقہ نظم و نسق دیا تھا اپنے ہاں ان بدنظمیوں کو روا نہیں رکھتی۔ پاکستان میں یہ مسئلہ زیادہ اہم نظر آیا۔ اس لئے کہ کسی حکومت کے قیام کے لئے ابتدائی دور میں جس عجلت اور کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہاں سرے سے مفقود نظر آئی۔ اس سلسلہ میں بعض نکات میری سمجھ میں آتے ہیں اگر در خورِ اعتنا ہوں تو کسی شمارے میں ان پر بھی لکھئے۔

(۱) پاکستان میں نظم و نسق کے نقائص کا تجزیہ کرتے وقت اس ماحول اور ان روایات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جن کے تحت پہلے ہمارے کارکنانِ حکومت کام کیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت اب کتنی ہی تلخ کیوں نہ معلوم ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان جو حکومت کے ملازم تھے انگریز اور ہندو سے بالعموم مرعوب تھے۔ انگریز نوٹ تو ان سے لکھواتا تھا لیکن فیصلہ اپنے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ اس انگریزی پالیسی نے ان ملازمین کو کارفرمائی کی اس ضروری صفت سے عام طور پر محروم کر دیا جسے قوتِ فیصلہ کہتے ہیں اب حالت یہ ہو کر یہاں ملازمین کی اکثریت قوتِ فیصلہ نہیں رکھتی۔ اور اس بارے میں سخت بزدل واقع ہوئی ہے۔ غور و فکر جانچ پڑتال بڑی اچھی چیز ہے لیکن بعض بڑے افسروں کے متعلق دیکھا گیا ہے کہ فائل ہفتوں میز پر پڑا رہا اور بہت ہوا تو چند استفسارات کے بعد واپس آ گیا۔ حالانکہ حقائق اپنی جگہ پر تھے۔ پھر جب سال بعد تنقید ہوا تو وہی ہوا جو ایک سال پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ اب تو یہ بیماری اتنی عام ہے کہ کسی طبقہ کا ملازم بھی فیصلہ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ فائل ایک میز سے دوسری میز پر منتقل ہوتی رہتی ہے اور سائل بیچارہ حیران و پریشان گھومتا رہتا ہے۔

(۲) انگریز نے جو قاعدے بنائے اور جو ضابطے مدون کئے وہ ایک خاص پالیسی کے تحت تھے کوئی آزاد مملکت ایسے ہی قواعد کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ جو ہمیں ورثہ میں ملے۔ اسے اربابِ نظر کی تنگ نظری کہئے۔ تقلیدِ جامد کا شعبدہ کہئے یا احساسِ کمتری کا نتیجہ کہ آج بھی بہت سے قواعد و ضوابط ایسے رائج ہیں جو ایک آزاد و خود مختار مملکت کے شایانِ شان نہیں۔ بعض قاعدے تو نہ صرف حکومت کی مشینری کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ بلکہ رعایا کے لئے بھی خواہ مخواہ دردِ سری کا باعث ہیں۔ ایک ملازم سرکار نے کوشش کی کہ ایک قاعدہ بدل دیا جائے اور ثابت کیا کہ ترمیم زیادہ سہولت بخش ہے لیکن اس کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی۔ اب ان کا عقیدہ ہے کہ حکومت پاکستان بھی ملا کی شریعت کی طرح انگریز کے بنائے ہوئے قواعد کو ناقابلِ ترمیم خیال کرتی ہے۔ ایک معاملہ میں ذاتی مشاہدہ ہے کہ ایک ملازم سرکار نے طریقہ کار بدلنے کی سفارش کی۔ جس کی بنا پر ۵۰ فیصد کفایت ہوتی تھی۔ لیکن اس تحریک کو محض اس لئے رد کر دیا گیا کہ اربابِ اقتدار میں طریقۂ نافذۂ انگریز بدلنے کی ہمت نہیں تھی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ملازمین صرف لکیر پیٹنے کے مقولہ پر عمل کرتے ہیں۔ انھوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ دلچسپی باقی نہیں صرف مکھی پر مکھی بٹھلاتے چلے جاتے ہیں اور حکومت خوش ہے کہ نظم و نسق قدیم معیار پر آ رہا ہے۔ حکومت کی ذہنیت کا اندازہ کیجئے کہ اس نے قبل از تقسیم کارکردگی والا معیار قرار دیا ہے۔ حالانکہ دنیا ایٹم بم سے ہائیڈروجن کی عمر بھی طے کر چکی۔ شرم تو جب آتی ہے جب بھارت کی تبدیلی کو یہاں معمولی ترمیم کے ساتھ اپنایا جاتا ہے۔ حالانکہ صورتِ حال برعکس ہونی چاہیئے تھی۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ بھارت کو سبق دیتے۔

۳۔ دنیا کی تمام متمدن حکومتیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ ان کے ملازم اگر خوش نہیں تو ناخوش تو نہ رہیں۔ لیکن پاکستان میں کسی محکمہ کے ملازم سے ملئے۔ وہ شاکی نظر آئے گا۔ سات سال گزرنے کے بعد بعض دفاتر میں ابتدائی مراحل قیام طے نہیں پا سکے کہیں پنکھا نہیں۔ کسی عمارت میں غسل خانہ نہیں۔ کسی کی چھت قابلِ ترمیم تو کہیں پینے کے پانی کا انتظام بھی نہیں۔

ملازمین سرکار میں بددلی کی کئی وجوہات ہیں۔

(الف) اعلیٰ افسروں کی خرد ماغی۔ ماتحت یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ آج بھی انگریز حاکم سے مخاطب ہے۔

(ب) باہمی اعتماد کا فقدان

(ج) چھوٹے اور بڑے ملازمین کے درمیان معاشرتی، سرکاری تفاوت۔ انتظام مملکت کے لئے طبقاتی تقسیم ضروری سہی لیکن سرکاری معاملات میں اس کا احساس ہونا نقصان کا باعث ہوتا ہے یہاں چھوٹا افسر بڑے افسر سے سرکاری معاملات میں دل کھول کر بات نہیں کر سکتا اس طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی انہیں کی جاتی۔ حالانکہ کسی دفتر کو کامیابی سے چلانے کا راز یہی ہے کہ قواعد کی پابندی کے ساتھ ساتھ افسریت کی جھلک بھی نظر نہ آئے بلکہ دو طبقوں کے ملازمین یہ محسوس کریں کہ وہ ایک خاندان کے فرد ہیں۔ اور ان کا مفاد مشترک ہے۔

خدانخواستہ اگر حکومت پر کوئی نازک وقت آ جائے۔ تو یہی نمک خواران سرکار اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کو تیار ہو جائیں گے۔ جیسا کہ زبان کی شورش کے سلسلہ میں حکومت مشرقی پاکستان کے ساتھ ہوا۔ چھوٹا اور بڑا ہر ملازم سرکار قلم پھینک کر باہر آ گیا۔ اور حکومت کی مشینری معطل ہو گئی۔ اس کی بنیادی وجہ اور تھی۔ لیکن پس منظر میں یہ علت بھی کارفرما تھی ملازمین کے ساتھ جس غفلت کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں جو تغافل برتا جاتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کے ساتھ خود اس کے ملازمین کو بھی ہمدردی نہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں تعلیمی سال مختلف اوقات میں شروع ہوتے ہیں۔ لیکن ملازمین کے تبادلے بمصالح انتظامِ مملکت کے تحت کئے جاتے ہیں۔ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں مبتدل ملازمین ملتے ملتے پھرتے ہیں لیکن کوئی ہیڈ ماسٹر کوئی کالج کا پرنسپل اُن سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تعلیم کی جو تجارت پاکستان میں ہوتی ہے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے، اور کوئی ایسا قاعدہ نہیں کہ مبتدلہ ملازمین کے بچوں کو اسکول یا کالج میں بے وقت داخلہ مل سکے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن کی بنا پر ملازم بددل۔ ناخوش اور متنفر رہتے ہیں۔ جس کا راست اثر حکومت کے نظم و نسق پر پڑتا ہے بعض امور تو بہت معمولی ہیں۔ جن پر اربابِ اقتدار کی ذراسی ہمدردانہ توجہ حکومت کی کارکردگی میں اضافہ کا موجب ہو سکتی ہے لیکن کون سمجھائے اور کسے سمجھائے؟

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سیر حاصل تبصرہ نہیں۔ بعض پہلو میں نے دانستہ چھوڑ دیئے ہیں اور اسی سلسلہ میں بعض دلچسپ ذیلی مسائل بھی زیرِ بحث آ جاتے ہیں۔ جن کو میں نے بخوفِ طوالت نظر انداز کر دیا ہے۔

اسلامی معاشرت

مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ، سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات

صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

قرانی فکر کی نشرو اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے۔ ظاھر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے۔یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ساھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تاآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح – – –

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سھولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی - اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے کے دلوں میں حسن عقابی رُوح کی بیداری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے بال و پر کی بالیدگی میں "مفسرِ قرآن" و "ترجمانِ اقبال" جناب پرویز کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصہ نمایاں ہے۔

"فردوسِ گم گشتہ" اسی صاحبِ نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے۔ اور ہر حساس قلب کو جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے، پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورت گری را ز من بیاموز
شاید که خود را باز آفرینی

ضخامت ۴۱۲ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت -/۶

علاوہ محصول ڈاک

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi.
Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi, Editor: KHURSHID ALAM